MUD-008

Classical Urdu Poetry

کلاسیکی اردو شاعری

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اسکول آف ہیومنٹیز

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

Vol-1

جلد اول

تعلیم انسان کو بے جا پابندیوں سے آزاد کرتی ہے اور آج کے عہد میں یہ جمہوریت کے احساس کی بنیاد ہے۔ تعلیم نسل اور دیگر حالات سے پنپنے والی ذات، برادری اور دوسری طبقاتی تفریق کو ختم کر کے انسان کو ایسی تمام برائیوں سے اوپر اٹھاتی ہے۔

اندرا گاندھی

"Education is a liberating force, and in our age it is also a democratising force, cutting across the barriers of caste and class, smoothing out inequalities imposed by birth and other circumstances."

- Indira Gandhi

MUD-008
کلاسیکی اردو شاعری

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

جلد اول

بلاک 1
اردو قصیدہ 9

بلاک 2
اردو کے نمائندہ قصیدہ نگار اور متن کی تدریس و تفہیم 71

بلاک 3
اردو مثنوی 147

بلاک 4
اردو کے نمائندہ مثنوی نگار اور متن کی تدریس و تفہیم 199

EXPERT COMMITTEE

Professor Malati Mathur
Director, School of Humanities
IGNOU, New Delhi.

Professor Mohammad Faruq Ansari
NCERT
New Delhi.

Professor Mohd. Shahid Husain
Shahjahanabad Apartments
Sector -11, Dwarka, New Delhi

Professor S.M. Anwar Alam
Centre of Indian Languages, JNU
New Delhi.

COURSE COORDINATOR

Dr. Ahmad Ali Jauher, Assistant Professor, Discipline of Urdu, SOH, IGNOU, New Delhi

Course Editor:

Prof. Abu Bakr Abbad, Professor, Department of Urdu, University of Delhi: Delhi
Dr. Ahmad Ali Jauher, Assistant Professor, Discipline of Urdu, SOH, IGNOU, New Delhi

COURSE PREPARATION

Writers	Units
Dr. Aftab Alam, Assistant Professor, Department of Urdu, AMU, Aligarh	1, 4, 6 & 8
Dr. Abdul Hai, Assistant Professor, Department of Urdu, C.M. College, Darbhanga, Bihar	2
Dr. Raziuddin, Assistant Professor, Department of Urdu, West Bengal State University, Kolkata	3, 7, 10, 11, 13, 14
Dr. Noor Fatima, Assistant Professor, Department of Urdu, MANUU, Lucknow Campus, Lucknow	5
Dr. Md Khalid Anjum Usmani, Assistant Professor, Department of Urdu, Ram Krishna College Madhubani, Bihar	9, 12
Dr.Naushad Alam, Assistant Professor, Academy of Professional Development of Urdu Medium Teachers, T.T.I Building, JMI, New Delhi	15 & 18
Dr.Md. Mubashshir Husain, Assistant Professor, Department of Urdu, JMI, New Delhi	16, 17

PRODUCTION

Mr. Tilak Raj
Assistant Registrar
MPDD, IGNOU, New Delhi

June, 2023

© Indira Gandhi National Open University, 2023

ISBN: 978-93-5568-857-6

All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the copyright holder.

Further information on the Indira Gandh National Open University courses may be obtained from the university's office at MaidanGarhi, New Delhi-110068 or the official website of IGNOU at www.ignou.ac.in

Printed and published by MPDD on behalf of theIndira Gandhi National Open University.

CRC Prepared by Tessa Media & Computers

Printed at : Saraswati Offset Printers Pvt. Ltd., Saraswati House, A-5, Naraina Industrial Area, Ph-II, New Delhi-110028

فہرست

بلاک 1	**اردو قصیدہ**	**9**
اکائی 1	قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات	11
اکائی 2	قصیدہ کی اقسام، موضوعات اور ادبی و تہذیبی اہمیت	27
اکائی 3	دکن میں اردو قصیدہ کا ارتقا	41
اکائی 4	شمالی ہند میں اردو قصیدہ کا ارتقا	55
بلاک 2	**اردو کے نمائندہ قصیدہ نگار اور متن کی تدریس و تفہیم**	**71**
اکائی 5	مرزا محمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم	73
اکائی 6	شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم	93
اکائی 7	مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم	111
اکائی 8	محمد محسنؔ کاکوروی: حیات، قصیدہ نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم	127
بلاک 3	**اردو مثنوی**	**147**
اکائی 9	مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات	149
اکائی 10	مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ)	161
اکائی 11	دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا	175
اکائی 12	شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا	187
بلاک 4	**اردو کے نمائندہ مثنوی نگار اور متن کی تدریس و تفہیم**	**199**
اکائی 13	ملا اسد اللہ وجہیؔ: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ	201
اکائی 14	محمد نصرت نصرتیؔ: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ	215
اکائی 15	شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطیؔ: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ	231
اکائی 16	میر غلام حسنؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم	247
اکائی 17	پنڈت دیا شنکر نسیمؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم	267
اکائی 18	مرزا تصدق حسین شوقؔ لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم	285

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

کورس کا تعارف

موجودہ دور میں فاصلاتی نظام تعلیم کو سماج میں جو حیرت انگیز مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، اس سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ اب یہ نظام تعلیم ملکی و بین الاقوامی سطح پر رواج عام کی شکل اختیار کرتا اور دن بہ دن اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس نظام تعلیم کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں لرنرز (سیکھنے والے) کو گھر میں رہتے ہوئے اپنی سہولت کے اعتبار سے تعلیم حاصل کرنے کا پورا اختیار ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ نظام تعلیم قریب کے طلبا کے ساتھ ساتھ ہزاروں میل دور تک کے طلبا کو تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا یکساں موقع فراہم کرتا ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ اس میں عمر کی پابندی کی دشواری نہیں ہے۔ چوتھی خوبی یہ ہے کہ یہ نظام تعلیم کم خرچ پر بہتر تعلیم حاصل کرنے کا سنہرا موقع دیتا ہے۔ اس نظام تعلیم نے سماج کے کمزور اور محروم افراد تک تعلیم کی رسائی کو آسان بنایا ہے۔ غرض اس نظام تعلیم نے عصر حاضر کے تمام چیلینجز کو قبول کرتے ہوئے سماج کے تمام طبقوں تک تعلیم کو پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی خوبیوں کی بنیاد پر ملکی و بین الاقوامی سطح پر فاصلاتی نظام تعلیم کی دل کشی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نظام تعلیم میں باقاعدہ کلاس نہیں ہوتی ہے بلکہ سیلف لرننگ میٹریل کے ذریعے نصابی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر کورس کو تیار کرتے ہوئے کئی بنیادی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت طالب علموں کے لیے کورس کو تیار کرتے ہوئے اس بات کا بہ طور خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ طلبا کو کلاس روم میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے کورس کو مختلف بلاک اور بلاک کے تحت اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اکائی کے ڈھانچے کو دل چسپ بنانے کے لیے اسے 'اغراض و مقاصد'، 'تمہید'، 'اصل موضوع'، 'ماحصل'، 'آپ نے کیا سیکھا؟'، 'اپنا امتحان خود لیجیے'، 'سوالوں کے جوابات'، 'فرہنگ' اور 'کتب برائے مطالعہ' کے تحت مختلف حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ 'اغراض و مقاصد' میں اکائی کے مطالعے کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ 'تمہید' میں اکائی کا مختصر اور مربوط تعارف پیش کیا گیا ہے۔ 'اغراض و مقاصد' کو پڑھتے ہی طلبا کے ذہن میں تجسس اور تحرک پیدا ہوتا ہے۔ 'تمہید' اس تجسس اور تحرک کو اور بڑھاتی ہے اور طلبا کو اکائی پڑھنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرتی ہے۔ اکائی کے اصل موضوع کو بھی حسب ضرورت ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے تا کہ طلبا دل چسپی کے ساتھ موضوع کے اہم متعلقہ گوشوں کا مطالعہ کر کے اس پر عبور حاصل کریں۔ اکائی سلیس اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے تا کہ طلبا کو معلومات حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اکائی کے اصل موضوع کے بعد 'ماحصل' میں اصل موضوع کا نچوڑ بیان کیا گیا ہے۔ پوری ذہنی آمادگی کے ساتھ اکائی کے اصل مواد اور اس کے نچوڑ کا مطالعہ کر لینے کے بعد 'آپ نے کیا سیکھا؟' کے تحت کچھ نمایاں اور خاص نکات کی نشان دہی کی گئی ہے تا کہ طلبا کو پوری اکائی کا خاکہ اچھی طرح ذہن نشیں ہو جائے۔ اس کے بعد طلبا کو سرگرم رکھنے کے لیے 'اپنا امتحان خود لیجیے' کے تحت کچھ مختصر سوالات قائم کیے گئے ہیں اور 'سوالوں کے جوابات' کے تحت ان مختصر سوالوں کے جوابات دیے گئے ہیں تا کہ طلبا اپنے مطالعہ کا از خود جائزہ لے کر امتحان کی

مشق کرسکیں۔ طلبا کی آسانی کے لیے ہر اکائی میں ’فرہنگ‘ کے تحت مشکل الفاظ کے معانی دیے گئے ہیں۔ تمام اکائیوں کے آخر میں ’کتب برائے مطالعہ‘ کے تحت معاون کتابوں کی فہرست دی گئی ہے تاکہ طلبا ان کتابوں سے رجوع کر کے اپنی معلومات میں اضافہ اور اپنی علمی تشنگی کی آبیاری کرسکیں۔

’کلاسیکی اُردو شاعری‘ کے نام سے ایم۔اے اُردو کا یہ کورس ۸ بلاک اور ۳۳ اکائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ ۸ کریڈٹ کا کورس ہے۔ اس کورس کا بنیادی مقصد طلبا کو کلاسیکی شعری اصناف؛ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رُباعی، شہر آشوب، ریختی، قطعہ اور دیگر کلاسیکی شعری ہیئتوں سے روشناس کرا کر ان کے اندر اس کی سمجھ اور دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ یہ کورس غزل کے علاوہ کلاسیکی اُردو شاعری کے تقریباً تمام پہلوؤں کا خوب صورتی سے احاطہ کرتا ہے۔ قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی، فنی خصوصیات، اس کی اقسام، موضوعات، ادبی وتہذیبی اہمیت، دکن اور شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کا ارتقا، اُردو کے نمائندہ قصیدہ نگاروں کے سوانحی احوال وکوائف، ان کی قصیدہ نگاری اور ان کے قصائد کے منتخب متن کی تشریح، مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی، فنی خصوصیات، اس کی اقسام، دکن اور شمالی ہند میں اُردو مثنوی کا ارتقا، اُردو کے نمائندہ مثنوی نگاروں کے سوانحی احوال وکوائف، ان کی مثنوی نگاری اور ان کی مثنویوں کے منتخب متن کی تشریح، مرثیہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی، فنی خصوصیات، اس کی ادبی وتہذیبی اہمیت اور مقبولیت کے اسباب، اُردو کے نمائندہ مرثیہ نگاروں کے سوانحی احوال وکوائف، ان کی مرثیہ نگاری اور ان کے مرثیوں کے منتخب متن کی تشریح، رُباعی کی تعریف، فن، ہیئت، روایت، اس کا آغاز وارتقا، مومن خاں مومنؔ اور میر ببر علی انیسؔ کی رُباعی نگاری، شہر آشوب، ریختی، قطعہ، واسوخت، ترکیب بند، ترجیع بند، مسمط، مستزاد، رزم نامہ، ساقی نامہ اور شکار نامہ، ان تمام پہلوؤں سے اس کورس میں بحث کی گئی ہے تاکہ کلاسیکی اُردو شاعری کا ایک مربوط ومبسوط خاکہ سامنے آسکے جس کے ذریعے طلبا کو کلاسیکی اُردو شاعری کے مزاج اور اس کے منفرد رنگ و آہنگ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ایم۔اے اُردو کا یہ کورس دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول اور حصہ دوم۔ کورس کے اس حصہ اول میں ۴ بلاک اور پہلی سے لے کر اٹھارہویں تک کی اکائیاں شامل ہیں جس میں اُردو قصیدہ اور اُردو مثنوی کے فن، موضوعات، اقسام، اس کے آغاز وارتقا، نمائندہ قصیدہ نگاروں اور مثنوی نگاروں کے سوانحی احوال وکوائف، ان کی قصیدہ نگاری اور مثنوی نگاری کی فکری وفنی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور ان کے قصائد اور مثنویوں کے منتخب متن کی تشریح وتوضیح بھی کی گئی ہے۔

بلاک ۱ ’اردو قصیدہ‘ سے متعلق ہے جس میں کل ۴ اکائیاں ہیں۔

پہلی اکائی کا عنوان (**قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات**) ہے۔ اس میں قصیدہ کی لغوی واصطلاحی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی کو بیان کرتے ہوئے اس کی صنفی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی فنی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔

دوسری اکائی بعنوان (قصیدہ کی اقسام، موضوعات اور ادبی و تہذیبی اہمیت) ہے۔ اس میں قصیدہ کے موضوعات اورفن کے اعتبار سے اس کی مختلف اقسام سے بحث کی گئی ہے، ساتھ ہی اس کے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اوراس کی ادبی وتہذیبی اہمیت کواُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسری اکائی کاعنوان (دکن میں اردوقصیدہ کا ارتقا) ہے۔اس میں دکن میں اُردوقصیدے کے پس منظر، اس کی روایت اورارتقا سے بحث کی گئی ہے، دکن کے اہم قصیدہ نگاروں پر گفتگو کرتے ہوئے دکنی اُردوقصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔

چوتھی اکائی (شمالی ہند میں اردوقصیدہ کا ارتقا) کےعنوان سے ہے۔اس میں شمالی ہند میں اُردوقصیدہ نگاری کے پس منظراوراس کے آغاز وارتقا سے مفصل بحث کی گئی ہے،شمالی ہند کےقصیدہ نگاروں سے متعارف کرایا گیا ہے اورشمالی ہندکی قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات کوبھی اُجاگر کیا گیا ہے۔

بلاک ۲ 'اُردو کےنمائندہ قصیدہ نگاروں کی قصیدہ نگاری' سے متعلق ہے جس میں پانچ سے آٹھ تک اکائیاں شامل ہیں۔

پانچویں اکائی بعنوان (مرزامحمد رفیع سوداؔ: حیات، قصیدہ نگاری اورمتن کی تدریس وتفہیم) ہے۔اس میں اُردو کےعظیم المرتبت قصیدہ نگارمرزامحمد رفیع سوداؔ کےسوانحی احوال وکوائف پرروشنی ڈالتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کےفنی محاسن سے بحث کی گئی ہےاوران کےمشہور قصیدہ 'اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سےعمل' کےمنتخب اشعار کی تشریح بھی پیش کی گئی ہے۔

چھٹی اکائی کاعنوان (شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: حیات، قصیدہ نگاری اورمتن کی تدریس وتفہیم) ہے۔اس میں اُردو کےممتاز قصیدہ نگارشیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کےسوانحی احوال وکوائف کو بیان کرتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کےفنی امتیازات سے بحث کی گئی ہےاوران کےمشہور قصیدہ 'زہےنشاط اگر کیجیے اسے تحریر' کےمنتخب اشعار کی تفہیم کی سعی کی گئی ہے۔

ساتویں اکائی بعنوان (مرزااسداللہ خاں غالبؔ: حیات، قصیدہ نگاری اورمتن کی تدریس وتفہیم) ہے۔اس میں مرزاغالبؔ کےسوانحی احوال وکوائف پرروشنی ڈالتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کےفنی محاسن پرگفتگو کی گئی ہےاور ان کےمشہور قصیدہ 'ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بےکار' کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔

آٹھویں اکائی کاعنوان (محمد محسنؔ کاکوروی: حیات، قصیدہ نگاری اورمتن کی تدریس وتفہیم) ہے۔اس میں محسنؔ کاکوروی کےسوانحی احوال وکوائف کو بیان کرتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری کےفنی محاسن اورانفرادیت سے بحث کی گئی ہےاوران کےمشہور قصیدہ 'سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل' کےمنتخب اشعار کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔

بلاک ۳ 'اُردو مثنوی' سے متعلق ہے جس میں نو سے بارہ تک اکائیاں شامل ہیں۔

نویں اکائی بعنوان (مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات) ہے۔ اس میں مثنوی کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی کو بیان کرتے ہوئے اس کی صنفی شناخت کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی فنی خصوصیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

دسویں اکائی (مثنوی کی اقسام (اخلاقی، داستانوی، رزمیہ) کے عنوان سے ہے۔ اس میں مثنوی کے موضوعات اور اس کی مختلف اقسام سے بحث کی گئی ہے اور مثنوی کی مختلف اقسام کے تحت نمائندہ مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جدید دَور میں اُردو مثنوی کے موضوعات میں جو تبدیلی آئی ہے، اس اکائی میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

گیارہویں اکائی کا عنوان (دکن میں اُردو مثنوی کا ارتقا) ہے۔ اس میں دکن میں اُردو مثنوی کے پس منظر اور بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی عہد میں اس کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں دکنی اُردو مثنویوں کی خصوصیات و امتیازات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بارہویں اکائی بعنوان (شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا) ہے۔ اس میں شمالی ہند میں اُردو مثنوی کے آغاز و ارتقا سے مفصل بحث کرتے ہوئے شمالی ہند کے نمائندہ مثنوی نگاروں اور نمائندہ مثنویوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات کی تفہیم کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

بلاک ۴ 'اُردو کے نمائندہ مثنوی نگاروں کی مثنوی نگاری' سے متعلق ہے جس میں تیرہ سے اٹھارہ تک اکائیاں شامل ہیں۔

تیرہویں اکائی کا عنوان (ملا اسداللہ وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ) ہے۔ اس میں اُردو کے بلند پایہ مثنوی نگار ملا وجہی کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی شاہ کار مثنوی 'قطب مشتری' کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی محاسن، امتیازات اور اس کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چودہویں اکائی بعنوان (محمد نصرت نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ) ہے۔ اس میں اُردو کے منفرد و ممتاز مثنوی نگار نصرتی کے مختصر سوانحی احوال و کوائف، ان کے ادبی کارناموں کو بیان کیا گیا ہے، ان کی معروف ترین مثنوی 'علی نامہ' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس کے فکری و فنی محاسن، امتیازات اور اس کی انفرادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پندرہویں اکائی (شیخ محمد مظہرالدین ابن نشاطی: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ) کے عنوان سے ہے۔ اس میں اُردو کے اہم مثنوی نگار ابن نشاطی کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کے ادبی کارناموں پر گفتگو کی گئی ہے، ان کی مشہور مثنوی 'پھول بن' کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں اور اس کی انفرادیت سے بحث کی گئی ہے۔

سولہویں اکائی کا عنوان (میر غلام حسنؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں اُردو کے عظیم المرتبت مثنوی نگار میر حسنؔ کے سوانحی احوال و کوائف، ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں، خصوصیات و امتیازات اور اس کی انفرادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں ان کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' کے منتخب اشعار کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

سترہویں اکائی بعنوان (پنڈت دیا شنکر نسیمؔ: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) ہے۔ اس میں اُردو کے نمائندہ اور ممتاز مثنوی نگار پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کے حالاتِ زندگی، ان کے ادبی کارناموں پر گفتگو کی گئی ہے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات و امتیازات اور اس کی انفرادیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں ان کی مشہور مثنوی 'گلزار نسیم' کے منتخب اشعار کی تشریح پیش کی گئی ہے۔

اٹھارہویں اکائی (مرزا تصدق حسین شوقؔ لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم) کے عنوان سے ہے۔ اس میں اُردو کے اہم مثنوی نگار نواب مرزا شوقؔ لکھنوی کے سوانحی احوال و کوائف، ان کے ادبی کارناموں کو بیان کیا گیا ہے، ان کی مثنوی نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات و امتیازات اور اس کے انفرادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں ان کی مشہور مثنوی 'زہرِ عشق' کے منتخب اشعار کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

MUD-008

کلاسیکی اردو شاعری

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

1

اردو قصیدہ

بلاک 1 کا تعارف

اکائی 1

قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات 11

اکائی 2

قصیدہ کی اقسام، موضوعات اور ادبی و تہذیبی اہمیت 29

اکائی 3

دکن میں اردو قصیدہ کا ارتقا 41

اکائی 4

شمالی ہند میں اردو قصیدہ کا ارتقا 55

بلاک 1 کا تعارف

بلاک ۱ 'اردو قصیدہ' سے متعلق ہے جس میں کل ۴ اکائیاں ہیں۔

پہلی اکائی کا عنوان (**قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات**) ہے۔ اس میں قصیدہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی کو بیان کرتے ہوئے اس کی صنفی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی فنی خصوصیات وانفرادیت سے بحث کی گئی ہے۔

دوسری اکائی بعنوان (**قصیدہ کی اقسام، موضوعات اور ادبی وتہذیبی اہمیت**) ہے۔ اس میں قصیدہ کے موضوعات اور فن کے اعتبار سے اس کی مختلف اقسام سے بحث کی گئی ہے، اس کے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی ادبی وتہذیبی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسری اکائی کا عنوان (**دکن میں اردو قصیدہ کا ارتقا**) ہے۔ اس میں دکن میں اُردو قصیدے کے پس منظر، اس کی روایت اور ارتقا سے بحث کی گئی ہے، دکن کے اہم قصیدہ نگاروں پر گفتگو کرتے ہوئے دکنی اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔

چوتھی اکائی (**شمالی ہند میں اردو قصیدہ کا ارتقا**) کے عنوان سے ہے۔ اس میں شمالی ہند میں اُردو قصیدہ نگاری کے پس منظر اور اس کے آغاز وارتقا سے مفصل بحث کی گئی ہے، شمالی ہند کے قصیدہ نگاروں سے متعارف کرایا گیا ہے اور شمالی ہند کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اکائی 1 قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

1.3.1 قصیدے کی تعریف

1.3.2 قصیدے کے موضوعات

1.3.3 قصیدے کے اجزائے ترکیبی

1.3.4 قصیدے کی فنی خصوصیات

1.3.5 ماحصل

1.4 آپ نے کیا سیکھا؟

1.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1.6 سوالوں کے جوابات

1.7 فرہنگ

1.8 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- قصیدہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی ومفہوم سے واقف ہوں گے۔
- قصیدے کے موضوعات سے بحث کریں گے۔
- قصیدے کے اجزائے ترکیبی کو سمجھیں گے۔
- قصیدے کی ہیئت سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- قصیدے کی صنفی خصوصیات وامتیازات کو سمجھیں گے۔

1.2 تمہید

عزیز طلبا! قصیدہ اُردو شاعری کی بے حد اہم اور قدیم صنفِ سخن ہے۔ کلاسیکی اُردو شاعری کی اصناف میں غزل،

مثنوی، مرثیہ اور رُباعی کے ساتھ ساتھ صنفِ قصیدہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ صنف غزل کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اس میں کسی اہم شخصیت یا عظیم ہستی کی تعریف کی جاتی ہے اور ان کے اوصافِ حمیدہ گنائے جاتے ہیں لیکن اس کے لیے بڑی فن کاری، ہنرمندی، خلاقی، تخیل اور علمیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ پر ہر خاص و عام شاعر نے طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ اُردو میں قصیدے کی متمول اور توانا روایت ہے۔ اس صنف نے اُردو کے شعری ادب کو ثروت مند بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس اکائی میں آپ قصیدے کے فن سے بحث کریں گے، اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی و مفہوم اور اس کے اجزاے ترکیبی سے واقف ہوں گے اور اس کی صنفی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

1.3 قصیدہ کی تعریف، اجزاے ترکیبی اور فنی خصوصیات

1.3.1 قصیدے کی تعریف

قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ قصد سے مشتق ہے۔ قصد کے معنی ارادہ کرنے کے آتے ہیں۔ چوں کہ قصیدہ ارادتاً کہا جاتا ہے یعنی شاعر جب کسی کی مدح کرتا ہے تو اِس میں اُس کے قصد و ارادے کو دخل ہوتا ہے، اس لیے اس معنی سے اس کی مناسبت واضح ہے۔ قصیدہ میں آمد سے زیادہ آورد کا حصّہ ہوتا ہے۔ عربی و فارسی قصیدوں میں بھی قصد و ارادہ کو بہ طور خاص اہمیت دی گئی ہے۔ عربی میں قصیدہ کے معنی گاڑھا مغز کے آتے ہیں۔ چوں کہ قصیدہ اپنے نادر و بلند اور پُر شکوہ مضامین کی وجہ سے شاعری کی تمام اصناف میں فوقیت رکھتا ہے، اس لیے اصنافِ شاعری میں اسے وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں سر کے مغز کو حاصل ہے۔

قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جس میں قادرالکلامی اور خوداعتمادی کا ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس کی توضیح یہ بھی ہے کہ قصد سے مراد شاعروں کا قصیدوں کو عملی طور پر برتنا ہے۔ قصد کے ایک معنی 'توڑنا' کے بھی آتے ہیں۔ چوں کہ قصیدہ کی ساخت میں کئی اجزا ہوتے ہیں، لہٰذا وہ مختلف حصوں میں جیسے تشبیب، گریز، مدح اور دعا میں تقسیم ہونے کے سبب اس معنی کی توضیح کرتا ہے۔ اس کے علاوہ قصیدہ کے ایک معنی چربی دار گودے کے بھی آتے ہیں۔ عربوں کے یہاں استعارۃً کلام فصیح کو قصیدہ کہا جاتا ہے۔ یہاں اس سے مراد ایسا کلام ہے جو شوکتِ الفاظ اور شوکتِ معنی، جزالت و وجاہت سے پُر ہو۔ القصد 'قصیدٗ' سے بھی مشتق ہے جس کے معنی موٹی اور فربہ اونٹنی کے آتے ہیں۔ کلام کے فصیح و بلیغ اور پُر مغز ہونے کے سبب بھی اس کا اطلاق قصیدہ پر ہونے لگا۔

قصیدہ ایسے شعر کو بھی کہتے ہیں جس کا بیان مکمل ہو۔ قصیدہ میں بھی شاعر اپنے کلام کو تکمیل کے مراحل تک پہنچا دیتا ہے اور اپنی بات اور مدعا کی وضاحت کر دیتا ہے۔ قصیدہ واحد ہے اور اس کی جمع قصائد ہے۔ بعض کے نزدیک قصیدہ خود جمع ہے۔ قصیدہ کے لغوی معانی سے صنفِ قصیدہ کی معنوی خوبیاں خود بہ خود بڑی حد تک اُجاگر ہو جاتی

قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات

ہیں۔ ان معنوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جو بذاتِ خود مکمل ہو، جس میں قادرالکلامی کا اظہار ہو، جس کے مضامین پُر مغز ہوں، جو فصیح و بلیغ ہو، مقصدیت سے پُر اور قابل اعتماد ہو، جس میں شوکتِ الفاظ و معانی کی خوبی ہو اور ایسا کلام ہو جسے عموماً بالارادہ کہا گیا ہو۔ اصطلاح میں قصیدہ ایک ایسی صنف سخن ہے جو مسلسل نظم کی صورت میں ہو، اس میں ربط و تسلسل ہو، اس کی ہیئت غزل کی ہو اور کسی کی مدح/ تعریف یا ذم پر مشتمل ہو۔

1.3.2 قصیدے کے موضوعات

قصیدے کے موضوعات بے حد متنوع اور وسیع ہیں۔ قصیدے کو مدح تک ہی محدود نہیں خیال کرنا چاہیے۔ اس میں ہر قسم کے خیالات اور مضامین قلم بند ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم قصیدے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ عربی قصیدہ میں صحرا، ریگستان، مناظرِ فطرت کی منظرنگاری، کھنڈرات کی یاد، عشق کی واردات، جذباتِ محبت، سخاوت و شجاعت، خاندانی وقار و عظمت، جوش، فخر، خودداری اور سادگی و آزادی کے بیانات ملتے ہیں۔ وہاں خوشامد، مدح سرائی اور جھوٹی تعریف کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسلام کے ظہور و عروج کے وقت اللہ اور رسولِ خدا کی توصیف ہی اس صنف کا محور بنی مگر بنوامیہ اور دورِ عباسیہ میں قصیدے کے موضوعات میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ بہ طور تمہید عشق و محبت کا اظہار، مناظرِ قدرت کی عکاسی، رندی و سرمستی محلوں اور عمارتوں کی تعریف خاص موضوع قرار پائی۔ قصیدے میں ہجونگاری، تغزل اور واقعہ نگاری کو بھی خاص جگہ ملی۔ مدح میں امراو سلاطین اور بزرگان دین کی تعریف عام موضوع بنی۔ ان کے علاوہ پند و نصائح اور اخلاق و موعظت کے بیانات بھی قصیدے کے مضامین میں شامل ہوئے۔ یہی قصیدہ جب ایران آیا تو ایرانی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ بن گیا۔ شعرا دربار سے منسلک ہو گئے اور مدح سرائی قصیدہ کی جان قرار پائی۔ لہٰذا مبالغہ، تصنع، ظاہر داری اور دورازکار تشبیہات و استعارات کا استعمال فارسی قصائد کے حصے میں آیا۔ تمہید میں بہار اور خزاں کے تذکرے، مناظرے اور مباحثے، علمی اصطلاحات کا بیان، شاعر کا سراپا، دیگر تقریبات کا بیان اور مدح میں ممدوح کے ذاتی اوصاف کے علاوہ اس کی سواری یعنی گھوڑے، ہاتھی وغیرہ، آلاتِ حرب جیسے تلوار، نیزے اور دیگر ساز و سامان کی تعریف قصیدے کا خاص جزو بن گئی۔ مذہبی قصائد میں انبیا، صوفیا اور بزرگانِ دین سے عقیدت و محبت کا اظہار بھی قصیدے کا موضوع بنے۔ اُردو میں یہ مضامین اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ منتقل ہوئے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تمہید میں عمارت کی تصویرکشی، موسموں، تقریبوں، رندی و سرمستی، عشق و محبت، شکایتِ روزگار اور جنگ و جدل اور فتوحات وغیرہ کو خاص جگہ ملی جب کہ مدح میں ممدوح کے اوصافِ حمیدہ یعنی اس کی عفت، سخاوت، شجاعت اور اس ضمن میں اس کی سواری اور آلاتِ جنگ وغیرہ کی تعریف جوش سے کرنے کا رجحان عام ہوا۔

1.3.3 قصیدے کے اجزائے ترکیبی

ایک مکمل قصیدہ کے چار حصے ہوتے ہیں:

۱۔تشبیب ۲۔گریز ۳۔مدح ۴۔عرضِ مدعا یا دعا

ا۔تشبیب:

تشبیب کو نسیب بھی کہا جاتا ہے۔دراصل یہ قصیدے میں تمہید کا کام کرتی ہے۔تشبیب کے پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے۔مطلع کو پُر شکوہ اور جدت خیال کا حامل ہونا چاہیے تا کہ بعد میں آنے والے اشعار کی طرف قاری یا ممدوح کا ذہن متوجہ ہو جائے۔قصیدے کے ابتدائی حصے کو تشبیب یا نسیب اس لیے کہا جاتا ہے کہ عربی شاعر اس میں عشقیہ باتیں کرتے تھے مگر اُردو قصیدے کی تشبیب میں ہر طرح کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔اس طرح یہ حصہ متنوع موضوعات کو پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔اس حصّے کو قصیدہ کی جان تصور کیا گیا۔گویا تشبیب جتنی انوکھی اور اچھوتی ہوگی، قصیدہ اتنا ہی دل کش اور جاذب ہوگا۔یہ جتنی جان دار اور پُر زور ہوگی، قادرالکلامی، قدرتِ بیان اور علمیت کا اظہار جس قدر ہوگا، قصیدہ کی کامیابی کا دارومدار اسی اعتبار سے طے ہوگا۔درحقیقت تشبیب کے موضوع سے ہی قصیدہ کو موسوم بھی کیا جاتا ہے۔یعنی اگر تشبیب میں موسمِ بہار کا ذکر ہے تو ایسا قصیدہ بہاریہ کہلاتا ہے۔جہاں حُزن وغم کا ذکر ہوگا تو اسے حُزنیہ قصیدہ کہا جاتا ہے۔برسات یا دیگر مظاہرِ کائنات کی منظر نگاری کی گئی ہے تو اسے منظریہ قصیدہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔تشبیب کا مطلع ہیئت کے اعتبار سے غزل کے مطلع کی طرح ہوتا ہے مگر قصیدہ نگار کے لیے لازم ہوتا ہے کہ مطلع بے حد منفرد ہو، جدتِ مضمون کا حامل ہو، شگفتہ اور اعلیٰ ہو تا کہ سامعین چونک اٹھیں اور ان کی دل چسپی شعر اول سے برقرار رہے۔تشبیب کی پہلی خوبی یہ ہے کہ تشبیب اور مدح کے مضامین میں ایک طرح کی مطابقت ہونی چاہیے۔لہٰذا تشبیب ایسی ہونی چاہیے جس کا کسی طرح کا تضاد مدح سے قائم نہ ہو۔جیسے کہ قصیدہ اگر کسی بزرگ، ولی یا نبیؐ کی مدح پر مشتمل ہے تو ایسے قصیدہ کی تشبیب میں رندانہ اور عاشقانہ مضامین کسی طور مناسب نہیں۔ہاں اگر کسی معروف شخصیت، نواب، بادشاہ یا وزیر کی مدح پر مشتمل قصیدہ تحریر کیا جا رہا ہے تو اس کی تشبیب رندانہ یا عاشقانہ ہو سکتی ہے۔ایک اچھا قصیدہ نگار تشبیب اور قصیدے کے دوسرے اجزا کے مابین ربط و توازن اور مطابقت کو ضروری خیال کرتا ہے اور جس قدر زور تشبیب پر صرف کرتا ہے، اتنا ہی دیگر اجزا پر بھی کرتا ہے۔قصیدے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ تشبیب کے اشعار کی تعداد مدح کے اشعار سے زیادہ نہ ہو۔تشبیب میں عام طور پر ایک ہی مطلع ہوتا ہے لیکن بعض شعرا نے ایک ہی تشبیب میں کئی کئی مطلعے بھی کہے ہیں۔اسی طرح تشبیب میں غزل کو بھی شامل کرنے کا رواج رہا ہے۔حالاں کہ ایسی غزلوں کی نوعیت عام غزلوں سے مختلف ہوتی ہے اور لب ولہجہ بھی قصیدے کے لب و لہجے کے مطابق ہوتا ہے۔جس دور میں قصیدے کہے جا رہے تھے، وہ جاگیرداروں اور نوابوں کا دور تھا۔وہاں بات بے حد سلیقے سے

کہی جاتی تھی۔ لہٰذا تمہید یعنی تشبیب بے حد ضروری تھی۔ براہ راست بات شروع کرنے اور مطلب و مدعا پر آنے سے قبل موضوع تک آنے کے لیے تمہید کا ہونا گویا لازم تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین نے لکھا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ قصیدے کے لیے تشبیب ضروری نہ ہوتے ہوئے بھی ضروری ہے کیوں کہ تمہید جاگیرداری عہد کا خاصہ تھا۔ کوئی بھی بات کہنی ہوتی تھی تو اسے تمہید کرنے کے بعد ہی کہتے تھے۔ تکلف و تصنع کی زندگی میں تمہید کی اہمیت بہت تھی۔ ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی قدم قدم پر اس کا استعمال ہوتا تھا۔ نام سے پہلے القاب و خطابات کا لیا جانا بھی ایک قسم کی تمہید ہی تھی۔ جب تمہید اس زندگی میں اس طرح جاری و ساری تھی تو جس صنف کا ماضی درباروں سے گہرے طور پر وابستہ تھا، وہ کس طرح سے بچ سکتی تھی۔''
>
> (ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین، قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری، دربھنگہ بک ہاؤس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ، ۱۹۸۸ء، ص: ۳۲)

۲۔ گریز:

گریز کے لفظ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر تشبیب سے گریز کر کے مدح کی طرف آ گیا ہے۔ اس کے ایک معنی گریزِ داستان کے بھی ہیں۔ عربی تنقید میں اسے دو سرکش بیلوں کے جوئے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس میں شاعر تشبیب سے مدح کی طرف آنے کے لیے اسے ایک زینہ یا پُل کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ گریز تشبیب اور مدح میں منطقی ربط پیدا کرنے کا کام کرتی ہے۔ یعنی شاعر تشبیب کہتے کہتے ممدوح کی تعریف کرنے لگتا ہے اور مدح کی طرف اس طرح گھوم جاتا ہے جیسے بات سے بات پیدا ہو رہی ہو۔ عربی شعرا نے شروع میں گریز کی طرف توجہ نہیں دی۔ لہٰذا ان کے یہاں تشبیب اور مدح کے مابین کوئی ربط قائم نہیں ہوتا لیکن بعد کے زمانے کے شعرا نے اسے ایک مستقل فن کی حیثیت دی اور فارسی شعرا نے اس میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کیں۔ اُردو شعرا نے اسی کی اتباع کی اور گریز کو بہ طور فن تصور کرتے ہوئے اس میں ندرت پیدا کی اور اس کا باقاعدہ اہتمام کیا۔ گریز کے شعر یا اشعار میں بڑی فن کاری اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام یاب گریز وہ ہوتی ہے جس میں شاعر بات سے بات پیدا کرتے ہوئے بڑے ہی مربوط انداز میں تشبیب سے مدح کی طرف آ جائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین رقم طراز ہیں:

> ''جیسے جیسے مدح کی منزل قریب آتی جاتی ہے، احتیاط کا دامن مضبوطی سے پکڑنا پڑتا ہے اور گریز کے توسط سے مدح تک پہنچ جاتے ہیں۔... قصیدہ گو ممدوح اور

سامع دونوں کو تشبیب کی گونا گوں کیفیات سے محو کر دیتا ہے پھر انھیں گریز کے ذریعے مدح کی زمین میں لے آتا ہے۔''

(ڈاکٹر ایم۔کمال الدین، قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری، ص: ۳۵، ۳۶)

گریز کبھی کسی منظر نگاری تو کسی سراپا کے بیان یا مکالماتی انداز میں ہوسکتی ہے۔ عام طور پر شعرا نے اسی انداز میں اس حصّے کا استعمال کیا ہے۔ اُردو قصائد کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ قصیدہ نگاروں نے با قاعدہ گریز کا اہتمام کیا ہے۔ بعض گریز روایتی انداز کی ہیں۔ کہیں منظر کی پیش کش ہے اور کہیں کسی کے سراپے کے حسن کا بیان تو کبھی کوئی مکالماتی انداز اختیار کر کے گریز کی گئی ہے۔ ایسی گریز میں قصیدہ نگار کو ہنر آزمانے کا خوب موقع ملا اور انھوں نے اپنے ذہن اور اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا خوب استعمال کیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گریز بھی مختصر سے مختصر ترین ہونے لگی۔ اکثر قصائد ایسے بھی ہیں جن کی گریز ایک شعر یا ایک مصرعے پر مشتمل ہے۔ حضرت علیؑ کی مدح میں سوؔدا کے قصیدے کی گریز ایک ہی شعر پر مشتمل ہے۔

ہے مجھے فیضِ سخن اس کی ہی مدّاحی کی
ذات پر جس کے ہیں مبَرہن کُنہ عزوجل

جب جاگیردارانہ نظام اور نوابی عہد کا زوال ہونا شروع ہوا اور نئی تہذیب اپنے ساتھ بہت سی مصروفیات اور مشغولیات لے کر آئیں تو قصیدے بھی مختصر لکھے جانے لگے۔ اس اختصار کا براہ راست اثر گریز پر پڑا۔ لہٰذا گریز ایک یا دو شعر تک محدود ہوگئی۔ البتہ جن شعرا نے گریز کا اہتمام کیا ہے، اسے بہ طورِ فن ہی برتا ہے۔ فنی اعتبار سے کام یاب قصیدہ نگار اسے سمجھا جاتا ہے جس کی گریز بے حد فطری اور مناسب ہو۔ محمد رفیع سوؔدا کے قصائد کی گریز فن کاری کا اعلیٰ نمونہ قرار دی جاسکتی ہے۔ قصیدہ 'درمدحِ امام ضامن' کی گریز کے یہ تین اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ حال دیکھ کے واں کا خرد سے پوچھا میں
جگہ طرب کی میں آیا ہوں یا کہ جائے عزا

دیا جواب خرد نے مجھے کہ اے ناداں
خوشی ہے دہر میں، غم سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا

نہیں ہے امن کہیں زیرِ آسماں ہرگز
بہ جز زمینِ خراساں کہ ہے وہ عرش آسا

۳۔ مدح:

مدح کے لغوی معنی تعریف کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں یہ قصیدہ کا تیسرا حصّہ ہے جو تشبیب اور گریز کے بعد اور

عرض مدعا اور دعا سے پہلے آتا ہے۔ اس حصے میں شاعر ممدوح کی تعریف بیان کرتا ہے۔ مدح کا میدان اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ قصیدہ نگار کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے، اپنے ممدوح کی تعریف کرے۔ قدیم ناقدین نے مدح کے بیان میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنے پر بہت زور دیا ہے۔ مدح میں ممدوح کی سماجی اور طبقاتی حیثیت کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ بادشاہوں، امرا و نوابین، علماء کرام اور بزرگانِ دین کی مدح میں اس کے مضامین کی تخصیص بھی کی جاتی ہے۔ مدح میں ممدوح کے اوصافِ حمیدہ اور امتیازی خوبیوں کو بنیاد بنا کر مضامین درج کیے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس حصے میں ممدوح کی سخاوت و شجاعت، عظمت و شرافت، عدل و انصاف، خلق و مروت، حمیت و خودداری، علمیت و صلاحیت، عبادت و ریاضت، کشف و کرامات، فیوض و برکات، صداقت و متانت، حسن و جمال اور وجاہت و جاذبیت وغیرہ کے علاوہ اس کے ساز و سامان، آلاتِ حرب، اس کی سواریوں اور عمارات و محلات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

گریز کے فوراً بعد جب مدح شروع ہوتی ہے تو بالعموم ممدوح کی تعریف صیغۂ غائب میں کی جاتی ہے جسے مدح غائب کہا جاتا ہے۔ پھر جب مدح آگے بڑھتی ہے تو ممدوح کو قصیدہ نگار براہ راست مخاطب کرتا ہے۔ اسے مدحِ حاضر کہا جاتا ہے۔ عام طور پر مدح حاضر کا آغاز کرنے کے لیے نیا مطلع پیش کیا جاتا ہے۔ اس حصّے میں قصیدہ نگار ممدوح کو بھرپور انداز میں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعر ممدوح کی تعریف و توصیف میں اپنی فنی ہنرمندیوں اور علمی صلاحیتوں کو صرف کرتا ہے تا کہ اس سے انعام و اکرام حاصل ہو سکے یا اس کو راضی اور خوش کر سکے۔ مدح میں توازن اور اعتدال شرط ہے لیکن مدح میں مبالغہ، غلو اور اغراق کو بھی اپنا کر شعرا نے مضامین اور معانی کے دفتر کھول دیے ہیں۔ اُردو کے اولین ناقد حالؔی اور شبلؔی دونوں نے مدح کی بنیاد واقعیت اور سچائی پر قائم کرنے کی تلقین کی ہے تا کہ ممدوح کے اوصاف صداقت کے ساتھ اُجاگر ہوں اور اس کی واقعی شخصیت عوام الناس کے سامنے آ سکے۔ شبلی کا قول ہے:

> ''(۱) جس کی مدح کی جائے، درحقیقت مدح کے قابل ہو۔
> (۲) مدح میں جو کہا جائے سچ کہا جائے۔
> (۳) مدحیہ اوصاف اس انداز سے بیان کیے جائیں کہ جذبات کو تحریک ہو۔''
> (شبلی نعمانی، شعر العجم (حصہ پنجم)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۲۱ء، ص: ۲۳)

ناقدین نے مدح کے حوالے سے مختلف بحثیں قائم کی ہیں۔ جیسے ممدوح کی حیثیت کے مطابق اس کی مدح ہونی چاہیے، ممدوح کی طبقاتی حیثیت کو بنیادی طور پر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جیسے بادشاہوں کی مدح وزرا یا امرا سے بالکل مختلف ہوگی۔ اسی طرح علما و حکما کی مدح بادشاہوں سے یا وزرا سے الگ ہوگی۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ مدح میں کن اوصاف کا تذکرہ کیا جائے۔ اہلِ فن اس امر پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ مدح میں اختصار سے کام نہ لیا جائے۔ بالخصوص مدح کے اشعار تشبیب سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ البتہ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ مدح

غیر ضروری طوالت کا شکار نہ ہونے پائے۔ مدح کو ممدوح کے مزاج اور اس کی طبیعت کے موافق پیش کیا جائے۔ چوں کہ قصیدہ عموماً دربار کی صنف ہے اور اسے بادشاہ یا اربابِ دولت کے حضور سنایا جاتا تھا، لہٰذا قصیدہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی نفسیات سے واقف ہو، فرقِ مراتب جانتا ہو، ذہن اور طبیعت سے آشنا ہو اور جہاں وہ قصیدہ پیش کر رہا ہے، وہاں کی فضا کو سازگار بنا سکے۔ ہم جب اُردو قصیدہ نگاری کی روایت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس بات کا بہ خوبی ثبوت مل جاتا ہے کہ دربار سے وابستہ قصیدہ نگار ممدوح کی نفسیات کے ماہر ہونے کے علاوہ دربار کی طرزِ معاشرت، وہاں کے رکھ رکھاؤ اور وہاں کی تہذیب سے اچھی طرح واقف ہوتے تھے۔ ممدوح اپنی مبالغہ آمیز تعریف سے خوش ہوتا تھا اور یہ تعریف اس کے مرتبے کے لحاظ سے بھلی اور مناسب بھی معلوم ہوتی تھی۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قصیدہ نگار خوشامدی تھے بلکہ اسے بہ طور فن اور آرٹ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس دور کی تہذیب اور شان تھی اور ان کی شناخت بھی اسی تہذیب سے قائم تھی۔ مدح کرتے وقت فرقِ مراتب کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ بڑے بڑے شعرا سے بھی اس میدان میں لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ یہ لغزشیں سوؔدا جیسے شاعر کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جیسے اگر شاعر حضور پاکؐ کی شان میں اشعار پیش کر رہا ہے تو وہ ایسے مضامین نہ پیش کرے جو اسے خدا کے درجے تک پہنچا دیں۔ اسی طرح ممدوح کے لیے ایسے مضامین نہ باندھے کہ وہ کوئی مافوق الفطری ہستی معلوم ہو اور مضحکہ خیز بن جائے۔ نمونے کے طور پر مدح کے چند اشعار دیکھیے:

شاہا تو وہ ہے نور مجسم کہ آفتاب
کرتا ہے نور کو ترے سائے سے اکتساب

جوہر سے تیری تیغ کے دکھلائے ہے قضا
سرکش کو لکھ کے حرف بہ حرف ایک عذاب

شاہا تری حمایت و دولت کے سائے میں
کنجشک، رشک باز ہے، رشکِ ہما غراب
(ذوقؔ)

سوؔدا شجاع الدولہ کی تعریف میں کہتے ہیں:

جس جگہ تیری مروّت کا زباں پر ہو ذکر
شعلہ واں خس کی اذیت کو سمجھتا ہے وبال

روز میداں قدم اپنا تو جہاں گاڑے وہاں
کوہ کا سینہ پھٹے دیکھ کر ترا استقلال
(سوؔدا)

سوداؔ عماد الملک کی مدح میں کہتے ہیں:

دست دوراں سے موالید کا سررشتہ کار
نعرۂ قہر کی ہیبت سے ترے جائے ٹھٹھک

تجھ کو للکار کے میداں میں صف مردان کے
سامنے آئے ترے کون ہے ایسا مردک
(سوداؔ)

۴۔عرضِ مدعاودعا:

یہ مدح کے بعد کی منزل اور قصیدے کا آخری جز و ہوتا ہے۔اس میں شاعر پہلے اپنے مدعا کو بیان کرتا ہے اور پھر اخلاقی طور پر ممدوح کو دعا دیتا ہے اور کبھی کبھی ممدوح کے دشمنوں کو بد دعا بھی دیتا ہے۔عموماً یہ حصّہ مختصر ہوتا ہے۔ بہ ظاہر آسان نظر آنے والی یہ منزل درحقیقت دشوار گزار منزل ہے۔یہاں اسے ایک اچھوتا انداز برتنا ہوتا ہے اور اپنے ممدوح کے سامنے بڑی ہنر مندی سے اپنا مدعا بیان کرنا ہوتا ہے تاکہ ممدوح مسرت اور خوشی سے سرشار ہو کر شاعر کو انعام واکرام سے نوازے۔دعا میں ممدوح کی اقبال مندی، درازیِ عمر، مال و دولت میں ترقی، ملک میں امن وامان اور نسل کی بقا جیسے مضامین ہوتے ہیں۔مذہبی قصائد میں موافقین کو دعا اور مخالفین پر تبرّا پڑھا جاتا ہے اور اپنے حق میں دعائے خیر طلب کی جاتی ہے۔عرضِ مدعا میں اشعار کی تعداد تو متعین نہیں ہے لیکن اس حصے کے لیے طوالت کے بجائے اختصار زیادہ مناسب ہے۔بہ ظاہر مختصر نظر آنے والا یہ جز و ایک قصیدہ نگار کے لیے چیلنج ہوتا ہے۔اسے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مدّعا ممدوح کی طبیعت کے عین مطابق ہو اور اس سے ممدوح اکتاہٹ کا شکار نہ ہو یا اسے سن کر وہ بدحظ نہ ہو۔لہٰذا عرضِ مدعا کے اشعار میں اچھوتا پن اور ندرت ہونی چاہیے اور اپنے مدعا یا مطلب کو بڑی فن کاری سے پیش کرنا چاہیے تاکہ ممدوح بے ساختہ خوش ہو کر اور فطری جوش سے مجبور ہو کر انعام واکرام سے نوازے۔بہت سے شعرانے عرضِ مدعا پر خاص توجہ نہیں دی ہے اور اسے نظر انداز کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قصائد میں مدح تو نہایت عمدہ ہے مگر عرضِ مدعا خالص نہ ہونے یا پست یا رکیک ہونے کے سبب قصیدہ کمزور ہو گیا ہے۔

مذہبی قصائد میں قصیدہ نگار روضے کی زیارت کی تمنا کرتا ہے۔پریشانی اور مصیبت میں مدد کی التجا کرتا ہے اور آخرت میں کام یابی کی دعا مانگتا ہے۔اسی طرح سلاطین، وزرا اور امرا سے متعلق قصائد میں ممدوح کی لمبی عمر، جاہ وحشمت میں بلندی، دولت میں ترقی، حکومت میں وسعت واستحکام اور بقا سے متعلق مضامین نظم کرتا ہے۔اس کے علاوہ دشمنوں اور مخالفین کو بد دعا دیتا ہے اور اپنے حق میں خیر کی طلب اور دعا مانگتا ہے۔بعض شعرا نے دعا کے بعد بھی قطعہ کا اضافہ کیا ہے جس میں اپنی شاعری کی تعریف اور نسلی تفاخر سے متعلق اشعار یا منظریہ اشعار پیش کیے

ہیں۔دعا سے متعلق ذوقؔ کے قصیدے کے یہ اشعار دیکھیے:

دیتا ہے دعا ذوقؔ کہ مضمونِ ثنا میں
ہے ذہن رسا کو یہ کہاں اس کے رسائی

ہر سال سُہا ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو مسندِ شاہی یہ کرے جلوہ نمائی

اسی طرح غالبؔ بھی بڑے ہی انوکھے اور اچھوتے انداز میں دعا پر اپنے قصیدے کا اختتام کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسن قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سوبار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں

صرف اعدا اثر بشعلۂ و دود دوزخ
وقف احباب گل وسنبل فردوس بریں

قصیدے کا تصور مدح کے ساتھ ساتھ ہجو سے بھی وابستہ ہے۔دونوں میں فرق موضوع کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔اگر قصیدے میں کسی کی تعریف کی گئی تو مدحیہ قصیدہ کہلاتا ہے اور اگر کسی کے عیوب بیان کیے گئے ہیں تو اسے ہجو یہ قصیدہ کہتے ہیں۔اوّلاً یہ صنف عربی میں رائج تھی اور پھر فارسی میں اسے قبولِ عام حاصل ہوا۔فارسی سے یہ صنف اُردو ادب کا حصّہ بنی۔اس اعتبار سے اس کی ایک قدیم روایت اور تاریخ رہی ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اصول وضوابط میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں اور اس کی شعریات مختلف مراحل سے گزر کر ایک طے شدہ ساخت میں ڈھل پائی۔

1.3.4 قصیدے کی فنی خصوصیات

قصیدے کی ہیئت:

عربی شاعری میں شاعری سے مراد قصیدہ ہی لیا جاتا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ شاعری ایک عرصے تک قصیدہ کی ہیئت میں ہوتی رہی۔ابن خلدون کے نزدیک ''قصیدہ ایک فصل کلام ہے جو مختلف حصّوں میں ہوتا ہے اور مساوی وزن میں ہوتا ہے''۔جب کہ ابن رشیق رجز کو بھی قصیدہ ہی تصور کرتے ہیں۔قصیدہ کی ہیئت غزل کی ہیئت سے مماثلت رکھتی ہے۔غزل کی طرح قصیدہ میں بھی مطلع ہوتا ہے اور اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف

ہوتے ہیں۔ بقیہ اشعار کے صرف دوسرے مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ قصیدہ مردف بھی ہوسکتا ہے اور غیر مردف بھی مگر قافیہ کا ہونا شرط ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے اور اس کے اشعار میں معنی کے اعتبار سے باہم تسلسل نہیں ہوتا جب کہ قصیدہ میں تسلسل ہوتا ہے اور معنوی طور پر اس کا ہر شعر مثنوی کی طرح دوسرے شعر سے منسلک ہوتا ہے۔ سمجھنے کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ قصیدہ خارجی ہیئت کے اعتبار سے غزل کی طرح اور معنوی اعتبار سے مثنوی سے مشابہ ہوتا ہے۔ حالاں کہ غزل میں اشعار کی تعداد عموماً کم ہوتی ہے جب کہ قصیدہ کے اشعار کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ غزل میں ایک ہی مطلع ہوتا ہے جب کہ قصیدہ میں ایک سے زیادہ مطلع کا بھی استعمال ہوسکتا ہے جو قصیدہ کے درمیان کہیں بھی آ سکتا ہے۔ اجزاے ترکیبی کے اعتبار سے بھی شاعر مطلع پیش کرسکتا ہے جسے تجدیدِ مطلع کہا جاتا ہے۔ بعض قصائد میں جب ساقی نامہ ہوتا ہے تو اس کے لیے مطلع کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دو مطلع والے قصیدے ذوالمطلعین اور دو سے زیادہ مطلع والے قصیدے ذوالمطالع کہلاتے ہیں۔ یہ فرق قصیدہ کو غزل سے الگ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قصیدہ مثنوی سے معنوی مشابہت رکھنے کے باوجود واضح فرق رکھتا ہے۔ مثنوی اور قصیدہ گو کہ بیانیہ صنفِ شاعری میں شمار ہوتے ہیں لیکن مثنوی کا بیان سیدھا سادا جب کہ قصیدہ کا اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے۔ قصیدے میں بیان کی شدت، لفظوں کی شوکت، عقیدت اور ہجو کی تیزی ہوتی ہے۔ جب کہ مثنوی میں واقعات نگاری ہوتی ہے، قصہ ہوتا ہے۔ قصیدہ کسی شخصیت کی مدح و ذم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مثنوی اور قصیدہ کا مقصد الگ الگ ہوتا ہے۔ قصیدہ کم از کم تین اشعار پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ زیادہ کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے۔ بعض ناقدینِ فن نے اس کی کم سے کم تعداد سات بتائی ہے۔ بعض نے بارہ یا پندرہ۔ کسی کسی نے اس کی تعداد اکیس اور پچیس بھی طے کی ہے۔

قصیدے کی زبان:

قصیدہ میں اس کی زبان بے حد اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قصیدہ میں برتے گئے الفاظ پُرشکوہ، متین، سنجیدہ، فصیح و بلیغ اور باوقار ہوں۔ سبک اور سوقیانہ یا مبتذل الفاظ سے گریز کیا جائے۔ الفاظ میں بھرپور معنویت ہو، استعارات و کنایات اور صنائع و بدائع کی آمیزش ہو، تراکیب خوب صورت اور عمدہ ہوں، الفاظ و معانی میں ایک نوع کا توازن ہو، صلابتِ الفاظ اس قدر نہ ہو کہ قصیدہ کی زمین ناہموار ہوجائے۔ تنافر اور تعقید سے پاک ہو۔ افہام و تفہیم اور ترسیلِ معانی کے ساتھ زبان دانی، تبحرِ علمی اور قادرالکلامی کا اظہار قصیدہ کا بنیادی وصف ہے۔ قصیدے کی زبان کے تعلق سے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

> ''قصیدہ کی ایک خاص زبان بن گئی ہے۔ یعنی بندش میں چُستی اور زور، الفاظ متین اور پرشان، خیالات میں بلندی اور رفعت، یہاں تک کہ قصیدہ کے شروع میں جو غزلیہ اشعار ہوتے ہیں، وہ بھی عام غزل کی زبان سے مختلف ہوتے ہیں۔''

(علامہ شبلی نعمانی، شعرالعجم (جلد پنجم)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۲۱ء، ص: ۲۹)

صنفِ قصیدہ نے مختلف النوع مضامین کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اُردو شاعری کو موضوعاتی وسعت بھی دی اور جدید لہجے سے آشنا بھی کرایا۔ تشبیب کو ہی پیش نظر رکھیں تو وہاں بہاریہ، نشاطیہ اور رندانہ اشعار نے خوشی وانبساط، سرشاری و بے خودی، فطری و قدرتی مناظر کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا اور ایک نوع کی رجائیت اُردو شاعری کا حصہ بنی۔ اسی طرح مدح کے حصّے میں دلیری، جواں مردی، جاہ وحشمت، رعب و دبدبہ، سخاوت وشجاعت، انصاف وصداقت، اخلاقی قدریں، طرزِ معاشرت اور تہذیب وثقافت اُردو شاعری کا بہ طور خاص موضوع بن سکیں اور پُرشکوہ آہنگ پیدا ہوا۔ قصیدے کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس میں برتے گئے نئے مضامین کے ساتھ ساتھ عملی تصورات واصطلاحات، الفاظ وتراکیب، محاورے اور ضرب الامثال سے زبان کا دائرہ وسیع ہوا۔ قصیدہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ علمیت کے ساتھ ساتھ اپنی زبان دانی کا بھی مظاہرہ کرے، زبان و بیان کے وسائل اور خلاقانہ طبیعت کو بروئے کار لائے، ممدوح کے اوصاف بیان کرنے میں اپنی ذہانت کا استعمال کرے اور ممدوح سے وابستہ تمام اشیا اور ساز وسامان کا بھی تذکرہ کرے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اس امر کی وضاحت بڑے ہی عمدہ طریقے سے کی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> ''قصیدہ ایک کلاسیکی صنفِ سخن ہے۔ غزل کی طرح اس کے کردار بھی متعین ہیں۔ جس طرح غزل میں کسی واقعی عاشق، حقیقی محبوب اور سچ مچ کے رقیب کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اس کے مضامین و موضوعات کا ایک خاص دائرہ ہے جس میں رہ کر کلاسیکی غزل گو اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور پھر زبان وبیان کے مختلف وسائل وامکانات کو بروئے کار لا کر اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح قصیدہ بھی خواہ وہ منقبتی ہو یا امرا وسلاطین کی مدح میں کہا گیا ہو، اپنے مخصوص اوصاف اور کردار رکھتا ہے۔ لہٰذا قصیدہ گو کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کرداروں اور ان کے اوصاف کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ذہانت وطباعی کا مظاہرہ کرے۔ مثلاً ممدوح اگر طبقۂ امرا وسلاطین سے تعلق رکھتا ہے تو قصیدہ میں اس کی شان وشوکت، رعب وداب، عدالت وانصاف، سخاوت و بخشش اور شجاعت وجواں مردی کا ذکر ضروری ہے۔ اسی طرح ساز وسامان میں گھوڑے اور اس کی برق رفتاری، تلوار اور اس کی برّش وغیرہ کا تذکرہ لازمی ہے۔ جب یہ موضوعات ومضامین تمام قصیدہ گو شعرا کا مشترکہ ورثہ ہیں تو پھر اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے قصیدہ گو کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ ان فرسودہ موضوعات ومضامین کے نئے گوشے اور پہلو دریافت کرے یا بیانِ وصف میں شدت وقوت پر زور دے۔ اس طرح مضمون آفرینی، دقت پسندی اور مبالغہ پروری کے بغیر معیاری اور مثالی قصائد کا وجود محال اور دشوار ہو گیا۔ کبھی اسی مقصد کے حصول کے لیے حسنِ تعلیل کا بھی سہارا لیا گیا۔''
>
> (پروفیسر ظفر احمد صدیقی، قصیدہ، اصل، ہیئت اور حدود، شعبہ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۲۰ء، ص:۷۶، ۷۷)

1.3.5 ماحصل

قصیدہ اُردو شاعری کی بے حد اہم اور قدیم صنفِ سخن ہے۔ کلاسیکی اُردو شاعری کی اصناف میں غزل، مثنوی، مرثیہ اور رُباعی کے ساتھ ساتھ صنفِ قصیدہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ صنف غزل کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اس میں کسی اہم شخصیت یا عظیم ہستی کی تعریف کی جاتی ہے اور ان کے اوصافِ حمیدہ بیان کیے جاتے ہیں لیکن اس کے لیے بڑی فن کاری، ہنر مندی، خلاقی، تخیل اور علمیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ پر ہر خاص وعام شاعر نے طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جو بذاتِ خود مکمل ہو، جس میں قادرالکلامی کا اظہار ہو، جس کے مضامین پُر مغز ہوں، جو فصیح و بلیغ ہو، مقصدیت سے پُر ہو اور قابلِ اعتماد ہو، جس میں شوکتِ الفاظ و معانی کی خوبی ہو اور ایسا کلام ہو جسے عموماً بالارادہ کہا گیا ہو۔ قصیدہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ علمیت کے ساتھ ساتھ اپنی زبان دانی کا بھی مظاہرہ کرے، زبان و بیان کے وسائل اور اپنی خلاقانہ طبیعت کو بروئے کار لائے، ممدوح کے اوصاف بیان کرنے میں اپنی ذہانت کا استعمال کرے اور ممدوح سے وابستہ تمام اشیا اور سازوسامان کا بھی تذکرہ کرے۔ غزل کی طرح قصیدہ میں بھی مطلع ہوتا ہے اور اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں جب کہ بقیہ اشعار کے صرف دوسرے مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ مضمون کے اعتبار سے قصیدے میں نظم کی طرح ربط وتسلسل ہوتا ہے۔ ایک مکمل قصیدہ کے چار حصے ہوتے ہیں۔ تشبیب، گریز، مدح اور عرض مدعا یا دعا۔ قصیدہ کم از کم تین اشعار پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ زیادہ کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے۔ قصیدے کے موضوعات بے حد متنوع اور وسیع ہیں۔ اس میں ہر قسم کے خیالات اور مضامین قلم بند ہو سکتے ہیں۔ قصیدہ نے مختلف النوع مضامین کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اُردو شاعری کو موضوعاتی وسعت بھی دی اور اسے جدید لہجے سے آشنا بھی کرایا۔ قصیدے کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس میں برتے گئے نئے مضامین کے ساتھ ساتھ عملی تصورات و اصطلاحات، الفاظ و تراکیب، محاورے اور ضرب الامثال سے زبان کا دائرہ وسیع ہوا۔ اُردو میں قصیدے کی متمول اور توانا روایت ہے۔ اس صنف نے اُردو کے شعری ادب کو ثروت مند بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

1.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- قصیدہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی ومفہوم سے واقفیت حاصل کی۔
- قصیدے کے موضوعات سے بحث کی۔
- قصیدے کے اجزائے ترکیبی کو سمجھا۔
- قصیدے کی ہیئت سے واقفیت حاصل کی۔

- قصیدے کی صنفی خصوصیات وامتیازات کو سمجھا۔

1.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ قصیدہ کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کو بیان کیجیے۔

۲۔ قصیدے کے موضوعات سے بحث کیجیے۔

۳۔ قصیدہ کی ہیئت پر روشنی ڈالیے۔

۴۔ قصیدہ کی زبان پر اظہارِ خیال کیجیے۔

۵۔ صنفِ قصیدہ کے امتیازات پر ایک نوٹ لکھیے۔

1.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ قصیدہ کے کئی لغوی معنی ہیں۔ جیسے ارادہ کرنا، توڑنا، چربی دار گودا، فربہ اونٹنی، بھروسہ اور اصل وغیرہ۔ اصطلاح میں قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جو مسلسل نظم کی صورت میں ہو، اس میں ربط وتسلسل ہو، اس کی ہیئت غزل کی ہو اور کسی کی مدح/تعریف یا ذم پر مشتمل ہو۔

۲۔ قصیدے کے موضوعات بے حد متنوع اور وسیع ہیں۔ عربی قصیدوں میں صحرا، ریگستان، مناظرِ فطرت، کھنڈرات کی یاد، عشق کی واردات، جذباتِ محبت، سخاوت وشجاعت، خاندانی وقار وعظمت، جوش، فخر، خودداری اور سادگی وآزادی کے بیانات ملتے ہیں۔ وہاں خوشامد، مدح سرائی اور جھوٹی تعریف کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسلام کے ظہور وعروج کے وقت خدا اور رسولِ خدا کی توصیف ہی اس صنف کا محور بنی مگر بنوامیہ اور دورِ عباسیہ میں قصیدے کے موضوعات میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ بہ طور تمہید عشق ومحبت کا اظہار، مناظرِ قدرت کی عکاسی، رندی وسرمستی، محلوں اور عمارتوں کی تعریف خاص موضوع قرار پائے۔ قصیدے میں ہجونگاری، تغزل اور واقعہ نگاری کو بھی خاص جگہ ملی۔ مدح میں امرا وسلاطین اور بزرگان دین کی تعریف عام موضوع بنی۔ ان کے علاوہ پند ونصائح اور اخلاق وموعظت کے بیانات بھی قصیدے کے مضامین میں شامل ہوئے۔ یہی قصیدہ جب ایران آیا تو ایرانی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ بن گیا۔ شعرا دربار سے منسلک ہوگئے اور مدح سرائی قصیدہ کی جان قرار پائی۔ لہٰذا مبالغہ، تصنع، ظاہرداری اور دورازکار تشبیہات واستعارات کا استعمال فارسی قصائد کے حصے میں آیا۔ تمہید میں بہار اور خزاں کے تذکرے، مناظرے اور مباحثے، علمی اصطلاحات کا بیان، شاعر کا سراپا، دیگر تقریبات کا بیان اور مدح میں ممدوح کے ذاتی اوصاف کے علاوہ اس کی سواری یعنی گھوڑے، ہاتھی وغیرہ، آلاتِ حرب جیسے تلوار، نیزے اور دیگر ساز وسامان کی تعریف قصیدے کا خاص جزو بن گئی۔ مذہبی قصائد میں انبیا، صوفیا اور بزرگانِ دین سے عقیدت ومحبت کا اظہار بھی قصیدے کا موضوع بنے۔ اُردو میں یہ مضامین اپنی تمام

ترخصوصیات کے ساتھ منتقل ہوئے۔

۳۔ قصیدہ کا پہلا شعر غزل کے پہلے شعر کی طرح مطلع ہوتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ بقیہ اشعار کے صرف دوسرے مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ قصیدہ مردف بھی ہوسکتا ہے اور غیر مردف بھی مگر قافیہ کا ہونا شرط ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے اور اس کے اشعار میں معنی کے اعتبار سے باہم تسلسل نہیں ہوتا جب کہ قصیدہ میں تسلسل ہوتا ہے اور معنوی طور پر اس کا ہر شعر مثنوی کی طرح دوسرے شعر سے منسلک ہوتا ہے۔ سمجھنے کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ قصیدہ خارجی ہیئت کے اعتبار سے غزل کی طرح اور معنوی اعتبار سے مثنوی سے مشابہ ہوتا ہے۔ غزل میں ایک ہی مطلع ہوتا ہے جب کہ قصیدے میں ایک سے زیادہ مطلع کا بھی استعمال ہوسکتا ہے جو قصیدے کے درمیان کہیں بھی آسکتا ہے۔ دو مطلع والے قصیدے ذوالمطلعین اور دو سے زیادہ مطلع والے قصیدے ذوالمطالع کہلاتے ہیں۔ یہ فرق قصیدے کو غزل سے الگ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قصیدہ مثنوی سے معنوی مشابہت رکھنے کے باوجود واضح فرق رکھتا ہے۔ مثنوی اور قصیدہ گو کہ بیانیہ صنفِ شاعری میں شمار ہوتے ہیں لیکن مثنوی کا بیان سیدھا سادا جب کہ قصیدہ کا اعلیٰ اور ارفع ہوتا ہے۔ قصیدے میں بیان کی شدت، لفظوں کی شوکت، عقیدت اور ہجو کی تیزی ہوتی ہے۔ مثنوی میں واقعات نگاری ہوتی ہے، قصہ ہوتا ہے جب کہ قصیدہ کسی شخصیت کی مدح وذم پر مشتمل ہوتا ہے۔

۴۔ قصیدہ میں اس کی زبان بے حد اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قصیدے میں برتے گئے الفاظ پُرشکوہ، متین، سنجیدہ، فصیح و بلیغ اور باوقار ہوں۔ سبک اور سوقیانہ یا مبتذل الفاظ سے گریز کیا جائے۔ الفاظ میں بھرپور معنویت ہو، استعارات و کنایات اور صنائع وبدائع کی آمیزش ہو، تراکیب خوب صورت اور عمدہ ہوں، الفاظ ومعانی میں ایک نوع کا توازن ہو، صلابتِ الفاظ اس قدر نہ ہو کہ قصیدہ کی زمین ناہموار ہوجائے۔ تنافر اور تعقید سے پاک ہو۔

۵۔ قصیدہ نے مختلف النوع مضامین کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اُردو شاعری کو موضوعاتی وسعت بھی دی اور اسے جدید لہجے سے آشنا بھی کرایا۔ تشبیب کو ہی پیش نظر رکھیں تو وہاں بہاریہ، نشاطیہ اور رندانہ اشعار نے خوشی وانبساط، سرشاری وبےخودی، فطری وقدرتی مناظر کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا اور ایک نوع کی رجائیت اُردو شاعری کا حصہ بنی۔ اسی طرح مدح کے حصّے میں دلیری، جواں مردی، جاہ وحشمت، رعب ودبدبہ، سخاوت وشجاعت، انصاف وصداقت، اخلاقی قدریں، طرزِ معاشرت اور تہذیب وثقافت اُردو شاعری کا بہ طور خاص موضوع بن سکیں اور پُرشکوہ آہنگ پیدا ہوا۔ قصیدے کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس میں برتے گئے نئے مضامین کے ساتھ ساتھ عملی تصورات واصطلاحات، الفاظ وتراکیب، محاورے اور ضرب الامثال سے زبان کا دائرہ وسیع ہوا۔

1.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
مراحل	:	مرحلہ کی جمع ،منزلیں، درجے
ذم	:	برائی،عیب
توضیح	:	وضاحت،صفائی
جزالت	:	اُستواری،پختگی،فصاحت، روانی
صلابت	:	مضبوطی،استحکام،شان وشوکت
شکوہ	:	شان وشوکت،عظمت، وقار
مساوی	:	برابر ہونا
مبالغہ	:	کسی بات کو بڑھاچڑھا کر بیان کرنا
شجاعت	:	بہادری
تصنع	:	بناوٹ
جنگ وجدل	:	جنگ،لڑائی
ممدوح	:	جس کی تعریف کی جائے
گفت وشنید	:	بات چیت
امرا	:	امیر کی جمع ، مال دار، حاکم، حکام سلطنت
سخن	:	شعر،کلام موزوں
مُبرَہن	:	دلائل سے ثابت، روشن، واضح
گُنجشک	:	گوریا
غراب	:	کوا

1.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔	قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود	:	پروفیسر ظفر احمد صدیقی
۲۔	اُردو میں قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ابو محمد سحؔر
۳۔	قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ایم۔کمال الدین
۴۔	اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	:	پروفیسر محمود الٰہی
۵۔	صنفیات	:	پروفیسر قاضی افضال حسین

اکائی 2 قصیدہ کی اقسام، موضوعات اور ادبی و تہذیبی اہمیت

ساخت

2.1 اغراض و مقاصد

2.2 تمہید

2.3 قصیدہ کی اقسام، موضوعات اور ادبی و تہذیبی اہمیت

2.3.1 قصیدہ کی اقسام

2.3.2 قصیدہ کے موضوعات

2.3.3 قصیدہ کی ادبی و تہذیبی اہمیت

2.3.4 قصیدہ کے زوال کے اسباب

2.3.5 ماحصل

2.4 آپ نے کیا سیکھا؟

2.5 اپنا امتحان خود لیجیے

2.6 سوالوں کے جوابات

2.7 فرہنگ

2.8 کتب برائے مطالعہ

2.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- اُردو قصیدہ کی مختلف اقسام سے واقف ہوں گے۔
- اُردو قصیدے کے موضوعات سے بحث کریں گے۔
- اُردو قصیدے کی ادبی اہمیت سے واقفیت حاصل کریں گے۔
- اُردو قصیدے کی تہذیبی اہمیت سے آگاہ ہوں گے۔
- اُردو قصیدے کے زوال کے اسباب کو سمجھیں گے۔

2.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اس کی فنی خصوصیات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ اس بات سے بھی آگاہ ہوئے کہ کلاسیکی اُردو شاعری میں قصیدہ کو ایک اہم صنف سخن کی حیثیت حاصل ہے۔ اُردو کے ممتاز اور بلند پایہ شعرا نے اس صنف میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا اور اسے بلندی پر پہنچایا۔ کلاسیکی اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کرنے میں صنفِ قصیدہ کا اہم کردار رہا ہے۔ ان امور کو

جاننے کے بعد اب اس اکائی میں آپ قصیدہ کی اقسام سے واقف ہوں گے، اس کے موضوعات سے بحث کریں گے اور اس کی ادبی و تہذیبی اہمیت کو سمجھیں گے۔

2.3 قصیدہ کی اقسام، موضوعات اور ادبی وتہذیبی اہمیت

2.3.1 قصیدہ کی اقسام

قصیدہ کی صنفی شناخت:

قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی بادشاہ، نواب، حاکم یا بزرگان دین کی مدح سرائی کی جاتی ہے۔ مدح یا تعریف کرنے میں شعرا ممدوح کے لیے پرشکوہ اور بھاری بھرکم الفاظ، تشبیہات اور استعارات کا استعمال کرتے ہیں تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ انعام واکرام مل سکے۔ قصیدہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

> ''قصیدہ کی ایک خاص زبان بن گئی ہے۔ یعنی بندش میں چستی اور زور، الفاظ متین اور پرشان، خیالات میں بلندی اور رفعت یہاں تک کہ قصیدہ کے شروع میں جو غزلیہ اشعار ہوتے ہیں، وہ بھی عام غزل کی زبان سے مختلف ہوتے ہیں۔''

(شبلی نعمانی، شعرالعجم (حصہ پنجم)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۲۱ء، ص: ۲۶۔۲۷)

قصیدے میں شعرا خود کو کم تر اور ممدوح کو برتر ثابت کرتے ہیں۔ قصیدہ کی تشبیب میں دنیا کے حالات، سلطنت میں رعایا کی صورت حال، عشقیہ واردات اور مختلف شعبہ حیات سے متعلق مسائل کا بھی بیان کیا جاتا ہے۔ قصیدہ گو جب بھی کوئی قصیدہ لکھتا ہے تو اس کا ایک واضح مقصد ہوتا ہے۔ سوؔدا کے قصیدے سے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جارہے ہیں۔ یہ قصیدہ نواب آصف الدولہ بہادر کی شان میں لکھا گیا تھا:

سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب وخور حرام — لائے گھر اس طبیب کے، ہے عقل جس کا نام
احوال اس کا دیکھ کے کہنے لگا طبیب — اب فصد ومسہل اس کے لیے ہے مفید تام
کہنے لگا اس کو وہ دیوانہ در جواب — مجھ میں لہو کہاں، یہ ترا ہے خیال خام

قصیدہ گو پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہے۔ وہ کافی بیمار ہے جس کا علاج کسی طبیب کے پاس نہیں ہے۔ آخر کار ایک طبیب جس کا نام عقل ہے، اس نے سوؔدا کو مشورہ دیا کہ تم ایسی شخصیت کے پاس جاؤ جس کی سلطنت میں

چیونٹی اور ہاتھی دونوں برابر ہیں۔ یعنی موجودہ حکمراں کے پاس جاؤ اور اپنی پریشانی بتاؤ، وہ تیری پریشانی دور کر دیں گے:

سنتے ہی یہ نوید قصیدہ برائے نذر　　لے کر اب اس جناب میں حاضر ہوا غلام

آگے کے اشعار میں ممدوح کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

مذکور حلم کا میں کروں یا بیان خلق　　یا میں تری شجاعت و ہمت سے اب کلام
تیرا ہی بار حلم ہے اے صاحب وقار　　کشتی خاک داں کا جو پانی پہ ہے قیام
اشجع تو اس قدر ہے ہے میداں میں روز جنگ　　کیا تاب روبرو ہوں ترے رستم اور سام

مذکورہ مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قصیدے میں کس طرح کا شاعرانہ طرز اظہار اختیار کیا جاتا ہے اور شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کے لیے کتنے جتن کرتا ہے اور کیسے کیسے القاب اور پُر شکوہ الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ قصیدے کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی کوئی حد مقرر نہیں ہے کیوں کہ درجنوں ایسے قصائد موجود ہیں جن میں اشعار کی تعداد سو یا دو سو تک سے بھی متجاوز کر گئی ہے۔

قصیدہ کی اقسام:

قصیدے کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ صنف عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں آئی ہے۔ ان تینوں زبانوں کے شعرا نے اس صنف کو عروج بخشا اور اپنے اپنے زمانے کے حالات و واقعات، سلاطین و امرا کی مدح، مختلف ادوار کی خصوصیات اور نیرنگیوں کو قصائد میں شامل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے قصیدے کی مختلف اقسام ہیں جو ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں:

مدحیہ قصائد : بادشاہوں، امرا و سلاطین کی شان میں لکھے گئے قصائد مدحیہ کہے گئے۔

حمدیہ قصائد : خدا کی شان اور بزرگی کو بیان کرنے والے قصیدے حمدیہ کہلائے۔

نعتیہ قصائد : حضرت محمد ﷺ کی تعریف و توصیف میں لکھے جانے والے اشعار کو نعتیہ قصائد کا نام دیا گیا۔

منقبت : بزرگانِ دین، اولیا اللہ اور ائمہ کی شان میں لکھے گئے قصائد کو منقبت سے موسوم کیا گیا۔

اسی طرح قصائد میں اور بھی موضوعات کے حساب سے ان کی اقسام متعین ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً:

منظریہ : جس میں شاعر اپنے گرد و پیش کے مناظر اور مختلف موسموں کی تصویر کشی کرتا ہے۔

فخریہ : ایسا قصیدہ جس میں شاعر تشبیب میں اپنی علمیت، لیاقت و صلاحیت، زبان دانی، کردار اور شعری امتیازات وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔

ہجویہ : ایسا قصیدہ جس میں زمانے کی بے ثباتی اور بدحالی کا ذکر ہو یا کسی کی برائی بیان کی گئی ہو۔ سودا کا قصیدہ 'تضحیک روزگار' اس کی عمدہ مثال ہے۔

وعظیہ : جس قصیدے میں نصیحتیں کی گئی ہوں یا کسی فن کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے سننے یا پڑھنے والے کو ویسا ہی بننے یا کرنے کی تلقین کی گئی ہو۔

بیانیہ : جس میں مختلف موضوعات اور حالات کو بیان کیا گیا ہو یا کسی شہر کی تباہی کا ذکر ہو جسے 'شہر آشوب' بھی کہا جاتا ہے جو بیانیہ کی ہی ایک قسم ہے۔

بہاریہ : ایسے قصائد جن کی تشبیب میں موسمِ بہار کا بیان کیا جائے اور شاعر فطرت کے حسن اور صناعی کو اپنے خوب صورت انداز میں رقم کرے۔

عشقیہ : ایسا قصیدہ جس کی تشبیب میں حسن اور عشق و عاشقی کا بیان کیا جائے۔

حالیہ : جس کی تشبیب میں زمانہ حال کی تصویر کشی کی جائے اور انقلابِ زمانہ کا ذکر ہو۔

دعائیہ : ایسا قصیدہ جس کا آغاز دعائیہ کلمات سے ہو۔

چرخیات : ایسے قصائد جن کی تشبیب میں فلکیات کا بیان کیا جاتا ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے مزید قسمیں بھی متعین کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً فکری، عرفانی، اخلاقی، صوفیانہ، شہرِ آشوب، رزمیہ۔

فنی اعتبار سے قصیدے کی دو قسمیں ہیں۔

تمہیدیہ : جس میں قصیدے کے اجزائے ترکیبی اور ہیئت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ آغاز تشبیب سے ہو پھر گریز اور مدح کے بعد دعا پر اس کا اختتام ہو۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اُردو میں زیادہ تر مدحیہ، نعتیہ یا پھر منقبتی قصائد لکھے گئے ہیں۔ قصیدے جس موضوع پر بھی لکھے گئے ہوں، ان کو قصائد تب ہی کہا جائے گا جب ان میں قصیدے کے اجزائے ترکیبی کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ یعنی تشبیب، گریز، مدح، دعا اور حسنِ طلب کے اشعار شامل ہوں۔ ممدوح کی سیرت اور اوصاف کو بیان کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر تمام اجزا کا دھیان رکھا جائے۔

خطابیہ : خطابیہ قصائد میں قصیدے کے دو اجزا تشبیب اور گریز نہیں ہوتے بلکہ شاعر اپنی بات براہ راست ممدوح کی تعریف سے ہی شروع کرتا ہے۔ قصائد کی ان قسموں سے قطع نظر، کچھ مزید قسمیں بھی ہیں جن کی بابت ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

''کبھی کبھی قصیدے کو اس کے قافیے کے آخری حرف سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً

قصیدہ جیمیہ، قصیدہ رائیہ، قصیدہ لامیہ، قصیدہ میمیہ وغیرہ۔ اکثر شعرا نے قصائد کو عنوان یا نام دینے کا بھی التزام کیا ہے۔ باب الجنت ، بحر بیکراں، رزمیہ بہار، فریاد زندانی، مطلع انوار اور درنجف بعض اُردو قصائد کے عنوانات ہیں۔ عنوان رکھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ قصیدے کے کسی شعر میں اس کا ذکر کردیتے ہیں۔ مثلاً:

تا مسمّٰی رہے یہ نظم بہ باب الجنت

جب تلک اس سے برآوے مری امید واُمل

(سودؔا، درمنقبت حضرت علیؓ)

(ڈاکٹر ابومحمد سحر، اُردو میں قصیدہ نگاری، تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۷)

2.3.2 قصیدہ کے موضوعات

قصیدے کے موضوعات میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں شاعر اپنے جذبات واحساسات، دنیاوی مسائل و مشکلات، حسن وعشق، ممدوح کی سواری مثلاً گھوڑے، ہاتھی، اس کے آلاتِ حرب مثلاً نیزے، تلوار اور اس کے لباس اور تاج وتخت وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔ قصیدہ اُردو میں خاص طور سے دو موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ ایک مدح اور دوسرا ہجو یا ذم۔ ان کے علاوہ دیگر دنیاوی موضوعات بھی قصیدے کا حصہ رہے ہیں۔ اُردو قصائد کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشیں رہے کہ دکنی قصیدوں میں مثنوی کو بھی شامل کرلیا گیا تھا۔ قصیدہ اور مثنوی دونوں میں بیانیہ شاعری کا وصف پایا جاتا ہے لیکن جہاں مثنوی میں قصہ گوئی کا ہونا ضروری ہے، وہیں قصیدہ اس شرط سے مبرا ہے۔ قصیدہ کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ہیئت اور موضوع دونوں کی وجہ سے اس کی امتیازی شناخت کا تعین ہوتا ہے۔ قصائد میں مذہب، فلسفہ، تصوف، سماجی علوم، موت اور زندگی، رُوح اور جسم کا رشتہ، عبادات، تقاریب، خیر وشر کی کش مکش، انسان کی ماہیت، کائنات اور بنی نوع انسان کا ارتقا، زمان ومکاں اور محبت ونفرت جیسے موضوعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اسی طرح کچھ قصیدوں میں طب، موسیقی، جفر، رمل، نجوم، سنگ تراشی، باغبانی، مصوری، نقاشی اور حرب جیسے علوم وفنون پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ قصائد میں سماجی زندگی کے تہذیبی پہلوؤں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ نام ور محقق اور ناقد امداد امام اثر نے اپنی مایہ ناز تصنیف ’کاشف الحقائق‘ میں قصیدے کے مضامین کے حوالے سے لکھا ہے:

> ’’غزل میں صرف مضامین داخلی بندش پاتے ہیں اور مضامین خارجی کو غزل سے علاقہ نہیں ہوتا مگر قصیدے کے لیے جو مضامین داخلی کو تمام تر حکیمانہ رنگ رکھنا چاہیے۔ مثلاً یہ قصیدہ کی شان سے ہے کہ اس میں توحید، عدل، نبوت، امامت، معاد، تمدن، معاش، معاشرت و دیگر امور دینی و دنیوی کے مضامین جگہ پا جائیں یا اخلاقی معاملات از قسم صداقت وخلوص وشجاعت وہمت، فتوت

ومروت وسخاوت وغیرہ موزوں کیے جائیں یا اعلیٰ درجہ کے مضامین ذہنیہ جو اقسام جذبات قلبیہ سے ہیں، زورِ بیان کا لطف دکھائیں۔ داخلی مضامین کے علاوہ جو خارجی مضامین باندھے جائیں، ان کو تقاضائے فطرت سے خالی نہیں ہونا چاہیے کہ قصیدہ میں بھی نیچرل مضامین کی حاجت ہے۔''

(امداد امام اثر، کاشف الحقائق، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی،۱۹۸۲ء،ص:۵۰۱)

2.3.3 قصیدہ کی ادبی وتہذیبی اہمیت

اُردو زبان وادب کو پروان چڑھانے میں مختلف اصناف سخن کا اہم کردار رہا ہے۔ جہاں غزل نے اُردو شاعری کو وقار بخشا، مرثیہ نے اُردو میں رزم و بزم، خیروشر کی جنگ کا نقشہ کھینچا اور انسانی رشتوں کی اہمیت کو اُجاگر کیا، مثنوی نے مافوق الفطری عناصر اور عام انسانوں کی دل چسپی کا سامان مہیا کیا، وہیں قصیدے کی صنف بھی اپنا ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ اس صنف سخن نے اُردو میں مدحیہ شاعری کو فروغ دیا۔ اس صنفِ شاعری میں تعریف وتوصیف اور مدح وستائش کے ساتھ ساتھ ہجو بھی کی جاتی ہے۔ قصیدے کو اس لیے بھی شاعری کی ایک اہم صنف تصور کیا جاتا ہے کہ اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں قصیدہ نگار اپنی خلاقانہ صلاحیت سے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ پُرشکوہ الفاظ، خوب صورت تلمیحات اور اچھوتے استعارات کا استعمال قصیدے کی اہم خصوصیت ہے۔ مدح کا جذبہ فطرتِ انسانی میں اس جہان کے آغاز سے ہی رہا ہے۔ جب اس جذبے نے شعری پیکر اختیار کیا تو قصیدے کا آغاز ہوا۔ اس صنف سخن کی ابتدا عرب میں ہوئی تھی جو ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئی۔ یہاں بھی اس صنف نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ یوں تو اُردو میں قصیدے کا آغاز اُردو شاعری کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے لیکن اس صنف کو جس شاعر نے شہرتِ دوام عطا کی، اس کا نام مرزا محمد رفیع سوؔدا ہے۔ سوؔدا سے قبل بھی بڑی تعداد میں قصائد موجود تھے لیکن سوؔدا نے قصیدے کو بے مثال مقام عطا کیا۔ اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ سوؔدا کی قصیدہ گوئی کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ وہ الفاظ کے استعمال کا ہنر جانتے تھے۔ ان کے پاس تشبیہات واستعارات کا خزانہ موجود تھا۔ وہ اس سے خوب خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ سوؔدا کے بعد فن قصیدہ گوئی میں دوسرا نام شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کا آتا ہے۔ انھوں نے بھی مدحیہ شاعری کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، سعادت یار خان رنگینؔ، ممنونؔ، مرزا غالبؔ اور مومنؔ وغیرہ نے بھی قصائد لکھے ہیں لیکن قصیدہ گوئی کے میدان میں وہ سوؔدا اور ذوقؔ کی طرح نام پیدا نہ کر سکے۔

قصیدے کو اُردو شاعری کی مہتمم بالشان صنف کہا جاتا ہے۔ اس صنفِ شاعری میں تنوع اور وسعت ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں رنگارنگ موضوعات اور مختلف مضامین کو جگہ ملی اور اُردو کی موضوعاتی شاعری میں اسے وقار حاصل ہوا۔ قصیدے کو اصناف سخن میں مغز کا درجہ دیا گیا ہے۔ مغز کی انسانی جسم میں بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اسی طرح اصناف شاعری میں صنفِ قصیدہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قصیدہ

میں پُرشکوہ الفاظ، خوب صورت تلمیحات، اچھوتی تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس صنفِ شاعری میں جدّتِ تخیل، ندرتِ فکر، اور زبان دانی کا بھرپور مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس میں زبان و بیان کی مہارت دیکھنے کو ملتی ہے اور اعلیٰ شعری ادب کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی اعتبار سے صنفِ قصیدہ بے پناہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قصائد کہنے یا لکھنے کا مقصد انعام و اکرام حاصل کرنا اور نوابین یا سلاطین کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ ریاستی نوابوں، انگریز حکمرانوں، امیروں اور رئیسوں کی شان میں لکھے ہوئے قصائد میں یہ مقاصد صاف طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ کئی جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں، وہ اس کے لائق نہیں تھے۔ یعنی بے جا مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ دراصل نواب اور حکمراں کچھ شاعروں کو دربار میں محض اس لیے رکھتے تھے کہ وہ ان کی تعریفیں لکھ کر عوام میں پھیلائیں اور رعایا ان سے خوش رہے۔ اسی طرح انگریز حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لکھے گئے قصائد میں شاعروں کی اپنی مجبوریاں صاف نظر آتی ہیں۔ جارج پنجم کی شان میں لکھے گئے قصیدے میں انھیں خدا کے فضل سے مستفیض تک کہہ دیا گیا ہے۔ ان قصائد سے انگریز حاکم ہندوستانیوں کے تئیں تھوڑا نرم ہوئے اور دونوں اقوام کے درمیان تہذیبی وثقافتی رشتوں میں استواری پیدا ہوئی اور اس میں مضبوطی آئی۔ اُردو قصائد میں ملکی حالات، رہن سہن، مختلف موسم کے مناظر، تیوہار، مختلف مقامات، آشوبِ زمانہ اور اس عہد کے دوسرے مسائل کا بیان اس کی تہذیبی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ اُردو قصائد میں ہندوؤں کے مذہبی اور اساطیری کرداروں کی شمولیت سے ہندو مسلم کے درمیان نزدیکی پر روشنی پڑتی ہے۔ اُردو قصائد میں رام، لچھمن، سیتا، رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، کرشن، گوپی، رادھا، کاشی، متھرا، گوکل اور برنداون جیسے الفاظ، مقامی تلمیحات وتشبیہات اور نادر استعارات و اصطلاحات کے استعمال سے اس کی تہذیبی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس کی ادبی اہمیت بھی اُجاگر ہوتی ہے۔ مذہبِ اسلام کے حوالے سے بہت سارے حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور اخلاقی قصائد تحریر کیے گئے۔ ان قصائد کے ذریعے مسلمانوں کی تہذیبی وتاریخی روایات کو اُردو ادب کا حصہ بنایا گیا۔ ان قصائد میں اسلامی عقائد وروایات کی جھلک واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ قصیدہ نگاروں نے مختلف سماجی وسائنسی علوم کے ساتھ ساتھ علم و آگہی، بصیرت و ایمان اور شعور وعرفان پر مبنی اعلا درجے کے مضامین کو قصیدوں میں شامل کیا۔ قصیدوں میں شجاعت اور بہادری کے قصوں نے لوگوں میں جوش پیدا کیا۔ قصیدوں میں مقامی رنگ اور اس دور کی تہذیب و معاشرت کے نقوش بھی نظر آتے ہیں اور امرا وسلاطین کے عہد میں عوام کے حالات ومسائل سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ اُردو قصائد میں ہماری تہذیب وثقافت کے انمٹ نقوش موجود ہیں جس کے آئینے میں ہم اپنے ماضی کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو قصائد ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ تہذیبی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔

2.3.4 قصیدہ کے زوال کے اسباب

قصیدہ قدیم صنف سخن ہے اور ساتھ ہی طویل تاریخی وتہذیبی آثار سے مالا مال ہے۔ اس صنف میں بادشاہوں اور امرا کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس صنف کو زیادہ تر انعام واکرام حاصل کرنے کے لیے برتا گیا۔ سرزمینِ اودھ نے اُردو قصیدوں کو کافی فروغ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں درباری مداحی اور عیش وعشرت کا بازار گرم تھا۔ بعد کے دنوں میں نہ وہ دربار رہے، نہ وہ امرا وسلاطین جو شاعروں سے اپنی تعریفیں سننے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ جس دور میں قصیدے کو فروغ ملا، اسی دور میں غزل بھی اپنی مقبولیت کے عروج پر تھی۔ اس دور میں لکھنؤ میں شیعیت کو بھی بہت زیادہ فروغ ملا اور مرثیے کے فروغ نے بھی قصیدے کے تئیں لوگوں کی دل چسپی کم کردی۔ مرثیہ مذہب سے جڑا ہوا تھا اور یہ قصیدے کا نعم البدل بھی ثابت ہوا۔ اس صنف میں بھی قصیدے کی طرح کافی گنجائش تھی۔ دہلی میں قصیدے کا زوال ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی سے ہوا کیوں کہ دربار اُجڑ گئے اور وہ موجود نہ رہے جن کے لیے قصیدے لکھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے اب قصیدہ کون سنتا اور شعرا کو صلہ سے کون نوازتا۔ صنعتی ترقی، سماج کے بدلتے حالات اور مشینوں کی ایجادات نے بھی قصیدے جیسی صنف کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرسید کی تحریک، آسان اور عام فہم زبان کے استعمال کے رجحان اور فطری اور حقیقت پسند شاعری کے فروغ نے بھی قصیدے کو زوال آمادہ کیا۔ مبالغہ اور غلو قصیدے کا ایک اہم جز و تھا لیکن دوسری شعری اصناف میں اب حقیقی وفطری شاعری ہونے لگی تھی۔ چنانچہ مبالغہ اور غلو معیوب قرار پائے۔ مولانا حالؔی نے قصیدے کو اخلاقی واصلاحی شاعری کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جو بارآور ثابت نہ ہوئی۔ صنفِ قصیدہ دربار سے وابستہ تھی۔ دربار کے زوال کے ساتھ ساتھ اُردو قصائد کا بھی زوال ہوا لیکن اُردو ادب کے کلاسیکی سرمایے میں اس کی اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

2.3.5 ماحصل

قصیدہ اُردو شاعری کی ایک بے حد اہم صنف ہے۔ یہ شعری صنف درباروں، رئیسوں اور نوابوں کے زیرِ اثر پروان چڑھی۔ اس میں کسی کی مدح یا تعریف وتوصیف بیان کی جاتی ہے۔ کچھ شاعروں نے مذہبی قصائد بھی لکھے اور اس میں اخلاقی واصلاحی مضامین بھی رقم کیے۔ اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں شاعر اپنے جذبات واحساسات، دنیاوی مسائل ومشکلات، حسن وعشق، ممدوح کی سواری مثلاً گھوڑے، ہاتھی، اس کے آلاتِ حرب مثلاً نیزے، تلوار اور اس کے لباس اور تاج وتخت وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔ قصیدہ اُردو میں خاص طور سے دو موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ ایک مدح اور دوسرا ہجو یا ذم۔ ان کے علاوہ دیگر دنیاوی موضوعات بھی قصیدے کا حصہ رہے ہیں۔ موضوعات کی اسی وسعت کی وجہ سے اس کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً: مدحیہ، حمدیہ،

نعتیہ، منقبت، منظریہ، فخریہ، ہجویہ، وعظیہ، بیانیہ، بہاریہ، عشقیہ، حالیہ، دعائیہ، چرخیات، فکری، عرفانی، اخلاقی، صوفیانہ، شہرِ آشوب اور رزمیہ۔ فنی اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں۔ تمہیدیہ اور خطابیہ۔ قصائد میں اعلا شعری ادب کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف ادبی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ قصائد میں پند ونصائح اور اخلاقی موضوعات کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ پرانے زمانے کے رسم ورواج، لوگوں کے سوچنے کے انداز، میلوں ٹھیلوں اور تیوہاروں وغیرہ کا بیان بھی ہوا ہے اور اس دور کی معاشرت اور طرزِ زندگی کو بھی پیش کیا گیا ہے جس سے امرا و سلاطین کے دور کے حالات کا علم ہوتا ہے اور اس دور کی تہذیب ومعاشرت کے نقوش بھی نظر آتے ہیں۔ صنفِ قصیدہ دربار سے وابستہ تھی۔ دربار کے زوال کے ساتھ قصیدہ کا بھی زوال ہوا لیکن آج بھی اس صنف کی اپنی اہمیت مسلم ہے اور اسے اُردو کے کلاسیکی سرمایے کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔

2.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- اُردو قصیدہ کی مختلف اقسام سے واقفیت حاصل کی۔
- اُردو قصیدے کے موضوعات سے بحث کی۔
- اُردو قصیدے کی ادبی اہمیت سے واقفیت حاصل کی۔
- اُردو قصیدے کی تہذیبی اہمیت سے آگہی حاصل کی۔
- اُردو قصیدے کے زوال کے اسباب کو سمجھا۔

2.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ قصیدے کے موضوعات سے بحث کیجیے۔

۲۔ فنی اعتبار سے قصیدے کی کتنی اقسام ہیں؟

۳۔ قصیدے کی ادبی وتہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

۴۔ قصیدے کے زوال کے اسباب کی نشان دہی کیجیے۔

۵۔ حمدیہ ونعتیہ قصائد کی تعریف بیان کیجیے۔

2.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ قصیدے کے موضوعات میں بڑی وسعت ہے۔اس میں شاعر اپنے جذبات و احساسات، دنیاوی مسائل و مشکلات، حسن وعشق، ممدوح کی سواری مثلاً گھوڑے، ہاتھی، اس کے آلاتِ حرب مثلاً نیزے، تلوار اور لباس اور تاج وتخت وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔قصیدہ اُردو میں خاص طور سے دو موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ایک مدح اور دوسرا ہجو یا ذم۔ان کے علاوہ دیگر دنیاوی موضوعات بھی قصیدے کا حصہ رہے ہیں۔قصائد میں مذہب، فلسفہ، تصوف، سماجی علوم، موت اور زندگی، رُوح اور جسم کا رشتہ، عبادات، تقاریب، خیر وشر کی کش مکش، انسان کی ماہیت، بنی نوع انسان کا ارتقا، زمان ومکاں، کائنات اور محبت و نفرت جیسے موضوعات کو بھی شاعروں نے جگہ دی ہے۔اسی طرح کچھ قصیدوں میں طب، موسیقی، جفر، رمل، نجوم، سنگ تراشی، باغبانی، مصوری، نقاشی اور حرب جیسے علوم وفنون پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

۲۔ فنی اعتبار سے قصیدے کی دو قسمیں ہیں:

تمہیدیہ: جس قصیدے میں اس کے اجزائے ترکیبی اور ہیئت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔آغاز تشبیب سے ہو پھر گریز اور مدح کے بعد دعا پر اس کا اختتام ہو۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اُردو میں زیادہ تر مدحیہ، نعتیہ یا پھر منقبتی قصائد لکھے گئے ہیں۔قصیدے جس موضوع پر بھی لکھے گئے ہوں، ان کو قصائد تب ہی کہا جائے گا جب ان میں قصیدے کے اجزائے ترکیبی کا لحاظ رکھا گیا ہو۔یعنی تشبیب، گریز، مدح، دعا اور حسنِ طلب کے اشعار شامل ہوں۔ممدوح کی سیرت اور اوصاف کو بیان کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر تمام اجزا کا دھیان رکھا جائے۔

خطابیہ: خطابیہ قصائد میں قصیدے کے دو اجزا تشبیب اور گریز نہیں ہوتے بلکہ شاعر اپنی بات براہ راست ممدوح کی تعریف سے ہی شروع کرتا ہے۔

۳۔ قصیدے کو اُردو شاعری کی مہتمم بالشان صنف کہا جاتا ہے۔اس صنفِ شاعری میں تنوع اور وسعت ہے۔اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں رنگا رنگ موضوعات اور مختلف مضامین کو جگہ ملی اور اُردو کی موضوعاتی شاعری میں اسے وقار حاصل ہوا۔قصیدے کو اصنافِ سخن میں مغز کا درجہ دیا گیا ہے۔مغز کی انسانی جسم میں بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔اسی طرح اصنافِ شاعری میں صنفِ قصیدہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔قصیدہ میں پُرشکوہ الفاظ، خوب صورت تلمیحات، اچھوتی تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس صنفِ شاعری میں جدّتِ تخیل، ندرتِ فکر، اور زبان دانی کا بھرپور مظاہرہ کیا جاتا ہے۔اس میں زبان و بیان کی مہارت دیکھنے کو ملتی ہے اور اعلا شعری ادب کے

اوصاف پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی اعتبار سے صنفِ قصیدہ بے پناہ اہمیت کی حامل ہے۔ اُردو قصائد میں ملکی حالات، رہن سہن، مختلف موسم کے مناظر، تیوہار، مختلف مقامات، آشوبِ زمانہ اور اس عہد کے دوسرے مسائل کا بیان اس کی تہذیبی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ قصائد میں ہندوؤں کے مذہبی اور اساطیری کرداروں کی شمولیت سے ہندو مسلم کے درمیان نزدیکی پر روشنی پڑتی ہے۔ قصائد میں رام، لچھمن، سیتا، رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، کرشن، گوپی، رادھا، کاشی، متھرا، گوکل اور برنداون جیسے الفاظ، مقامی تلمیحات وتشبیہات اور نادر استعارات واصطلاحات کے استعمال سے اس کی تہذیبی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس کی ادبی اہمیت بھی اُجاگر ہوتی ہے۔ مذہبِ اسلام کے حوالے سے بہت سارے حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور اخلاقی قصائد تحریر کیے گئے۔ ان قصائد کے ذریعے مسلمانوں کی تہذیبی وتاریخی روایات کو اُردو ادب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ان قصائد میں اسلامی عقائد وروایات کی جھلک واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ قصیدوں میں مقامی رنگ اور اس دور کی تہذیب ومعاشرت کے نقوش بھی نظر آتے ہیں اور امرا وسلاطین کے عہد میں عوام کے حالات ومسائل سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ اُردو قصائد میں ہماری تہذیب وثقافت کے انمٹ نقوش موجود ہیں جس کے آئینے میں ہم اپنے ماضی کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو قصائد ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ تہذیبی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔

۴۔ دہلی میں قصیدے کا زوال ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی سے ہوا کیوں کہ دربار اُجڑ گئے اور وہ موجود نہ رہے جن کے لیے قصیدے لکھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے اب قصیدہ کون سنتا اور شعرا کو صلہ سے کون نوازتا۔ لکھنؤ میں مرثیے کے فروغ نے قصیدے کے تئیں لوگوں کی دل چسپی کم کی۔ صنعتی ترقی، سماج کے بدلتے حالات اور مشینوں کی ایجادات نے بھی قصیدے جیسی صنف کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرسید کی تحریک، آسان اور عام فہم زبان کے استعمال کے رجحان اور فطری اور حقیقت پسند شاعری کے فروغ نے بھی قصیدے کو زوال آمادہ کیا۔ مبالغہ اور غلو قصیدے کا ایک اہم جز وتھا لیکن دوسری شعری اصناف میں اب حقیقی وفطری شاعری ہونے لگی تھی۔ چنانچہ مبالغہ اور غلو معیوب قرار پائے۔ مولانا حالیؔ نے قصیدے کو اخلاقی واصلاحی شاعری کے دائرے میں لانے کی کوشش کی جو بارآور ثابت نہ ہوئی۔ صنفِ قصیدہ دربار سے وابستہ تھی۔ دربار کے زوال کے ساتھ ساتھ اُردو قصائد کا بھی زوال ہوا لیکن اُردو ادب کے کلاسیکی سرمایے میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ حمدیہ قصیدوں میں خدا کی شان اور بزرگی کو بیان کیا جاتا ہے اور حضرت محمد ﷺ کی تعریف وتوصیف میں لکھے جانے والے اشعار کو نعتیہ قصائد کہا جاتا ہے۔

2.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
رزم و بزم	:	میدان جنگ اور محفل عیش وعشرت
مافوق الفطری	:	فطرت سے پرے، فطرت کے خلاف
مدح	:	تعریف کرنا، توصیف کرنا
ہجو	:	مذمت کرنا، برائی کرنا
پُرشکوہ	:	شان دار
تلمیحات	:	تلمیح کی جمع، کلام میں کسی قصے یا واقعے کی طرف اشارہ کرنا
شُہرتِ دوام	:	ہمیشہ برقرار رہنے والی شہرت، ابدی شہرت
تشبیہات	:	تشبیہ کی جمع، ایک چیز کو دوسرے کی مانند ٹھہرانا، باہمی مشابہت
ممدوح	:	جس کی تعریف کی جائے
مربوط	:	باہمی ربط یعنی جس میں ربط و منطقی ترتیب ہو، جڑا ہوا
جنوں	:	دیوانگی، عقل کھو دینا
طبیب	:	معالج، ڈاکٹر
فصد	:	رگ سے خون نکالنا، اخراج خون، جراحی
مسہل	:	دست لانے والی دوا
تام	:	پورا، مکمل
نوید	:	خوش خبری، اچھی خبر
مداح	:	تعریف کرنے والا
حلم	:	برداشت، نرمی، بُردباری، نرم دلی
خاک داں	:	مٹی اور کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ، راکھ دان، دنیا
اشجع	:	دلیر، بہادر، جری، شجاع
تاب	:	طاقت، مجال، قدرت

رستم وسام : رستم فارس کا ایک مشہور پہلوان تھا جس کا ذکر فردوسی نے اپنے شاہنامے میں کیا ہے، سام رستم کا دادا تھا، وہ بھی بہت بڑا پہلوان تھا۔

چرخ : آسمان

چرخیات : ایسی نظم جس میں آسمان کا تذکرہ ہو

شہرِ آشوب : ایسی نظم جس میں کسی شہر کی تباہی و بربادی اوراس کے اجڑنے کا تذکرہ ہو

امل : امید،آرزو،خواہش

تشبیب : قصیدے کی تمہید جس میں عشقیہ، بہاریہ،وعظیہ یادیگر مضامین باندھے جائیں

گریز : اجتناب، پرہیز،قصیدے میں تمہید کے بعد اور مدح سے پہلے کہے گئے اشعار اصطلاح میں گریز کہلاتے ہیں

جفر : حروف اوراعداد کے ذریعے غیب کے احوال معلوم کرنے کا علم

رمل : وہ علم جس میں لکیروں اور ہندسوں کے ذریعے غیب کی بات بتاتے ہیں

حرب : جنگ،لڑائی

معاد : لوٹ کر جانے کی جگہ،عقبیٰ،آخرت

قلبیہ : دل،دل سے متعلق

ذم : مذمت، برائی

نعم البدل : اچھابدلہ،نیک عوض

2.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔ اُردوقصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ : پروفیسر محمود الٰہی

۲۔ اُردو میں قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ابومحمد سحر

۳۔ اُردوقصائد کا سماجیاتی مطالعہ : ڈاکٹر اُمِّ ہانی اشرف

۴۔ اُردوقصیدہ نگاری (مرتبہ) : ڈاکٹر اُمِّ ہانی اشرف

۵۔ قصیدہ کا فن اوراُردوقصیدہ نگاری : ڈاکٹر ایم۔کمال الدین

۶۔ شعرالعجم : علامہ شبلی نعمانی

اردو قصیدہ	۷۔	کاشف الحقائق (مرتبہ)	:	پروفیسر وہاب اشرفی
	۸۔	انتخاب سودا (تصحیح وترتیب)	:	رشید حسن خاں
	۹۔	صنفیات	:	قاضی افضال حسین

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 3 دکن میں اردو قصیدہ کا ارتقا

ساخت

3.1 اغراض و مقاصد

3.2 تمہید

3.3 دکن میں اردو قصیدہ کا ارتقا

3.3.1 دکن میں اردو قصیدہ گوئی کا پس منظر

3.3.2 دکن کے ابتدائی قصائد

3.3.3 دکن میں اُردو قصیدہ کا ارتقا

3.3.4 ماحصل

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

3.6 سوالوں کے جوابات

3.7 فرہنگ

3.8 کتب برائے مطالعہ

3.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- دکن میں اُردو قصیدے کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
- دکن کے ابتدائی قصائد سے متعارف ہوں گے۔
- دکن میں اُردو قصیدہ نگاری کی روایت اور اس کے ارتقا سے بحث کریں گے۔
- دکن کے اہم قصیدہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- دکن کی اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

3.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ نے قصیدے کے لغوی اور اصطلاحی معنی و مفہوم، اجزائے ترکیبی اور اس کی فنی خصوصیات سے آگہی حاصل کی، ساتھ ہی اس کی اقسام، موضوعات اور ادبی و تہذیبی اہمیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ دکن میں اُردو قصیدے کے پس منظر سے واقف ہوں گے، اس کی روایت اور ارتقا سے بحث کریں

گے، دکن کے اہم قصیدہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور دکن کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

3.3 دکن میں اُردو قصیدہ کا ارتقا

3.3.1 دکن میں اُردو قصیدہ گوئی کا پس منظر

اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں قصیدہ گوئی کی کوئی خاص روایت نظر نہیں آتی۔ حالاں کہ اُردو شعرا کے سامنے فارسی قصیدے بہ طور نمونہ ابتدا سے ہی موجود تھے۔ محققین نے اس کے کئی اسباب بیان کیے ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صنفِ قصیدہ کا بنیادی تعلق مدح سے ہے اور دکن میں اکثر و بیش تر شعرا یا تو سلاطین تھے یا پھر صوفی و سالک۔ ایسے میں سلاطین کس کی مدح کرتے اور صوفی و سالک شعرا کو کسی بادشاہ یا سلطان کی مدح و ستائش کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ دوسرا سبب بعض محققین نے یہ بتایا ہے کہ چوں کہ زبان اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی، ایسے میں قصیدہ جیسی صنف میں طبع آزمائی کرنا قدرے مشکل امر تھا کیوں کہ قصیدے کو وسیع زبان درکار ہوتی ہے جس میں الفاظ کی کمی نہ ہو اور شاعر اپنے ممدوح کی مدح کرتے وقت الفاظ کے قصر تعمیر کرنے میں کسی بھی طرح کی پریشانی محسوس نہ کرے۔ زبان و بیان کی دقت کے علاوہ محققین نے دکن میں قصیدہ کے زیادہ فروغ نہ پانے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ دکنی سلاطین کا تعلق شیعہ مکتبِ فکر سے تھا، اس لیے ان کے نزدیک مرثیوں کی وقعت زیادہ تھی اور مرثیہ گوئی سے شاہی قرب اور اعزاز و انعام حاصل ہوتا تھا۔ ساتھ ہی مرثیوں میں ائمۂ کرام کی مدح و توصیف بھی بیان کی جاتی تھی۔ اسی لیے قصیدہ کی خاص ضرورت باقی نہ رہی۔ ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چوں کہ وہاں قصیدہ نگاری کا کام مثنویوں سے لیا جاتا تھا، اس لیے قصیدہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس وقت مثنوی نگاری ہی دربار میں مقام و مرتبہ اور اعزاز حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ اسی لیے بیش تر مثنویوں کے آغاز میں بادشاہ وقت کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں۔ بعض شعرا نے قصیدہ تحریر بھی کیا تو مثنوی کی ہیئت میں۔ جیسا کہ محققین نے کلیات بحرؔی کی مثال پیش کی ہے جس میں عنوان قصیدے کا اور ہیئت مثنوی کی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے:

> ’’قصیدے اور بعض دوسری اصناف میں درباری زندگی کو کافی دخل حاصل ہے۔ چوں کہ اس عہد میں (عہدِ عادل شاہی، سولھویں صدی) دکنی شاعری درباری اثر سے محفوظ تھی، اس لیے قصیدے نہیں ملتے۔‘‘
>
> (ڈاکٹر نذیر احمد، علی گڑھ تاریخ ادب اُردو (پہلی جلد)، شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص: ۲۴۹)

شاید یہی سبب ہے کہ پروفیسر محمود الٰہی نے اپنی تحقیقی کتاب میں بہمنی ، عادل شاہی اور قطب شاہی ادوار میں بہ طورِ صنف سخن قصیدے کے وجود سے انکار کیا ہے۔ حالاں کہ دکنی محققین نے بہمنی سلطنت کے زمانے کے شیخ آذریؔ، مشتاقؔ اور لطفیؔ جیسے شعرا کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کے یہاں قصائد کے نمونے ملتے ہیں۔ اگر چہ ان شعرا کے بارے میں معلومات محدود ہیں تاہم کئی محققین نے ان کا ذکر کیا ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے مشتاقؔ اور لطفیؔ کو بہمنی دورِ حکومت کا شاعر قرار دیتے ہوئے ان کے قصائد کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

3.3.2 دکن کے ابتدائی قصائد

دکن میں قصیدہ گوئی کی روایت کا آغاز مشتاقؔ اور لطفیؔ سے ہوتا ہے جن کے قصائد کے نمونے دستیاب ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض مثنویوں یا دوسری تحریروں میں بھی قصیدے کے عناصر موجود تھے۔ مثلاً مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں سلطان علاء الدین بہمنی کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔ قطب الدین قادری کے 'سیرت نامہ' میں اس کے ممدوح شیخ طریقت محمد ابراہیم مخدوم کی شان میں اشعار کا نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح قطب شاہی دور کے شاعر احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر چہ بہ طور صنفِ سخن قصیدے کا رواج دکن میں ابتدائی دنوں میں نہیں ہوسکا تاہم اس دور کی مثنویوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن کو اگر علاحدہ کر کے رکھا جائے تو ان پر قصیدے کا گمان گزرے گا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنے مضمون 'اُردو میں قصیدہ نگاری کا آغاز وارتقا' میں پروفیسر سیدہ جعفر کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

> ''دکنی مثنویوں میں پیش کیے ہوئے یہ مدحیہ اشعار قصائد نہیں کہلائے جاسکتے لیکن ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شعرائے دکن میں مدحیہ شعر گوئی کا جوہر موجود تھا اور انھوں نے قصائد کے علاوہ مثنوی میں بھی جہاں ضرورت سمجھی، اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں قصیدہ صرف اپنے موضوع ہی سے پہچانا نہیں جاتا بلکہ اپنی ہیئت اور مقاصد اور اپنے سانچے کے ساتھ ادبی افق پر نمودار ہوتا ہے۔ قصیدے میں ہیئت اور مواد ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ ان کے بغیر اس صنفِ سخن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صرف مدح کے موضوع کو پیش نظر رکھ کر جن ادبی شکلوں میں مدحیہ اشعار موجود ہوں، انھیں قصیدے سے تعبیر کرنا ایک صریح غلطی ہوگی۔''
>
> (سیدہ جعفر، دکنی ادب میں قصیدے کی روایت، ص:٦٦، بحوالہ غزل، قصیدہ اور رُباعی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد، ص:١٩٢)

محققین نے دکنی شاعری کے مدحیہ پہلو کو قصیدے کی روایت سے جوڑا ہے اور انھیں ہی دکنی شاعری میں قصیدے کا نقش اول قرار دیا ہے۔ دکنیات کے ماہر ڈاکٹر محمد علی اثر غواصیؔ سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''دکنی کے اولین قصائد بیش تر صوفیوں اور مذہبی رہنماؤں کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر قصائد ایسے ہیں جن میں قصیدے کے فارم کی پابندی نہیں کی گئی ہے جو فارسی میں مروج تھا، بلکہ قدیم اُردو کے متعدد قصیدے مثنوی کے فارم میں لکھے گئے۔ بعد کو فارسی میں قصیدوں کا مروجہ فارم دکن میں بھی مقبول ہونے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے دکن میں قصیدے کا فارم اور اس کی مخصوص ہیئت کو شعرا نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنایا تھا۔ اس سلسلے میں مشتاقؔ اور لطفیؔ کے کلام سے قصیدے کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جنھیں بہمنی دور کے شعرا بتایا گیا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر محمد علی اثر، غواصیؔ: شخصیت اور فن، مکتبہ شعر و حکمت، حیدرآباد، ۱۹۷۷ء، ص:۱۲۸)

مشتاقؔ نے ایک قصیدہ سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی تعریف و توصیف میں لکھا ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

ناز کا اے طرز ہے کھینچے وفا پر قلم — غمزہ کا اے طور ہے گود میں پالے ستم

لطف سخن یوں اہے شہد جیوں نیش میں — راکھے قہر مہر میں شیریں میں راکھے اوسم

فتنہ شجاعت کا دیکھ رستم دستا چھپا — شور سخاوت کا سن ہوگیا حاتم اصم

نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں مشتاقؔ کے اس قصیدے کے اشعار بہ طور نمونہ درج کیے ہیں جو اس نے خواجوئے کرمانی کے فارسی قصیدے کی زمین میں کہا ہے۔ لطفیؔ کے قصائد کے نمونے بھی موجود ہیں البتہ شیخ آذریؔ کے قصیدوں کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اُردو' میں یہ تو بتایا ہے کہ آذریؔ نے قصیدے لکھے تھے لیکن ان کا کوئی نمونۂ کلام یا ان کے اشعار درج نہیں کیے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر ابو محمد سحر نے یہ قیاس لگایا ہے کہ چوں کہ آذریؔ نو وارد ایرانی شاعر تھے، اس لیے زیادہ امکان یہ ہے کہ انھوں نے فارسی میں قصیدہ کہا ہو، اُردو میں نہیں۔ البتہ ان ابتدائی تفصیلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دکن میں بہمنی دور میں قصیدہ گوئی کی روایت شروع ہوگئی تھی، اس لیے ڈاکٹر نذیر احمد یا پروفیسر محمود الٰہی کی باتوں کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ نصیر الدین ہاشمی نے بہمنی دور میں شعر و ادب کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس دور میں مثنوی کے ساتھ غزل اور قصیدے بھی لکھے گئے۔ شاعری میں بحر، قافیہ اور ردیف کا تتبع کیا جاتا تھا۔... قصیدوں میں جو لوازم اس کے مخصوص تھے، یعنی تمہید، گریز، مدح اور خاتمہ ان ہی کی پابندی کی جاتی تھی۔''

(نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اُردو، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص: ۷۳)

یہاں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر چہ دکن میں اُردو قصیدہ نگاری پر خصوصی توجہ نہیں دی گئی تاہم قصیدوں کے اثرات دکنی شاعری میں بکثرت موجود ہیں اور کئی اہم شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

3.3.3 دکن میں اُردو قصیدہ کا ارتقا

دکن میں اُردو قصیدہ کا اصل سفر بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد شروع ہوتا ہے جب قطب شاہی اور عادل شاہی جیسی علم دوست سلطنتیں وجود میں آئیں۔ ان سلطنتوں کے ساتھ خاص بات یہ رہی کہ ان کے سلاطین خود باذوق شعرا گزرے ہیں اور اسی سبب انھوں نے شعر وادب کی خوب خدمات انجام دی ہیں۔ دکن میں قصیدہ گو کی حیثیت سے نمایاں کارنامہ انجام دینے والا شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے جس نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار پایا۔ قلی قطب شاہ نے صنفِ قصیدہ کی طرف باضابطہ توجہ دی۔ شاید اسی سبب بعض ماہرینِ علم و ادب نے اسے اُردو کا پہلا قصیدہ گو شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس کے کلیات میں کل بارہ قصیدے شامل ہیں جن میں سے چھے نامکمل ہیں۔ اس کے کلیات میں حمد و نعت کے ساتھ ساتھ عید، عید قربان، عید میلاد النبی، نوروز اور بسنت جیسے موضوعات پر قصیدے شامل ہیں۔ 'باغ محمد شاہی' کی تعریف میں بھی اس نے ایک بہترین قصیدہ تحریر کیا ہے۔ اگر چہ یہ نظمیں مکمل طور پر قصیدے کی تعریف پر پورا نہیں اُترتیں، البتہ ان کی تشبیبوں نے بیش تر ناقدین کی توجہ حاصل کی ہے۔

قلی قطب شاہ کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ ظل اللہ نے بھی قصیدے لکھے تھے مگر ان کا نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہے۔ یہ قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد بھی تھا۔ قطب شاہی سلطنت کے سلطان اور محمد قلی قطب شاہ کے نواسے عبداللہ قطب شاہ نے بھی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اس کے کلیات میں قصائد بھی شامل ہیں۔ بسنت، مرگ، ٹھنڈ کالا وغیرہ پر اس کی مدحیہ نظمیں قصیدے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس کی مدحیہ نظموں میں مذہبی رنگ و آہنگ بھی نظر آتا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کے مطابق اس کے 'کلام میں لفظی شان وشوکت، زبان کی سلاست خاص طور پر قابلِ ذکر ہے'۔ عشرت محل نام کے ایک محل سے متعلق اس کی مدحیہ نظم کے چند اشعار دیکھیے:

یو دلکشا عشرت محل مطبوع اوتارا ہوا   جوتی زمیں کی پیٹھ پر جیوں مشتری تارا ہوا

ہر طاق یاں خوش طرح کا دستا دریچہ فرح کا   عاجز ہو اس کی شرح کا حیران سنسارا ہوا

عبداللہ قطب شاہ کے ہم عصر شعرا میں ایک شاعر ملا قطبی گزرا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے قیاس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالباً اس کا نام قطب الدین تھا۔ اس نے اپنے پیر و مرشد شاہ ابوالحسن بیدریؔ کے مشورے پر ۱۰۴۵ھ میں خواجہ یوسف کے فارسی قصیدے 'تحفۃ النصائح' کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس قصیدے میں مذہبی احکامات و آداب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ۷۸۶ ابیات ہیں اور قطبی نے ان کا فارسی زمین میں من و عن ترجمہ کیا ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہے۔ ان شعرا کے بعد قصیدہ گوئی کی روایت میں محمد افضلؔ اور غواصیؔ کا نام آتا ہے۔ افضلؔ بھی بیجاپور کا قادر الکلام شاعر گزرا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں اس کے اشعار موجود ہیں اور انھیں پڑھ کر فنِ قصیدہ گوئی پر اس کی دسترس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غواصیؔ بیجاپور کا ملک الشعرا رہا ہے۔ وہ دکن کے نمائندہ شعرا میں سے ہے جس نے نہ صرف یہ کہ کامیاب اور مشہور ترین مثنویاں تحریر کی ہیں بلکہ غزلوں کے علاوہ قصیدے، رُباعیاں اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے کلیات میں ۲۱ قصائد شامل ہیں۔ حالاں کہ محققین کے مطابق اس کے قلمی نسخے میں ۳۵ قصائد تھے جن میں سے بعض قصائد کو اس کے ناقص الاشعار ہونے یا دیگر شعرا کے کلام کا اشتباہ ہونے کے سبب کلیات میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ وہ باکمال قصیدہ گو رہا ہے جس نے فارسی کے مقبول قصیدہ گو شاعر ظہیرؔ فاریابی اور کمال خجندیؔ وغیرہ کی زمینوں میں قصیدے لکھے اور اپنے تخلیقی جوہر کا کامیاب مظاہرہ کیا۔ غواصیؔ کے یہ تمام قصائد عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ہیں۔ اس نے ایک قصیدہ منقبت علیؑ میں اور ایک قصیدہ باری تعالیٰ کی تحمید میں تحریر کیا ہے، البتہ ان دونوں قصائد میں بھی بادشاہ کی تعریف کا موقع اور جواز نکال لیا ہے۔ غواصیؔ کے قصیدے فنِ قصیدہ گوئی پر اس کی دسترس کا ثبوت ہیں۔ اس کے قصیدوں کی تشبیب یا گریز میں بھرپور فن کاری نظر آتی ہے۔ اس کی مدح سرائی بھی قابلِ تعریف ہے۔ اس عنصر میں اس پر فارسی شعرا کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں جو دیگر دکنی شعرا کے یہاں نظر نہیں آتا۔ عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں کہے گئے اس کے یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

اگر گدا کوں ترا لطف بات پکڑے آج   تو پل میں اس کو شہنشاہ روم و شام کرے

جو فرد جاہ سو تو گھر منے تھے نکلے بھار   تو سورگھن تھے اتر آتج سلام کرے

ڈاکٹر زورؔ نے غواصیؔ کے قصیدوں کی ادبی اہمیت و وقعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''غزلوں کے بعد کلیات غواصیؔ کے ۳۵ قصائد بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس لیے
کہ اتنے زیادہ اور اتنے طویل اور اتنے عمدہ قصائد کسی دکنی شاعر کے اب تک

دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ یوں تو محمد قلی، نصرتی، افضل اور ولی وغیرہ کے قصائد موجود ہیں مگر تعداد اور تنوع کے لحاظ سے موجودہ معلومات کی حد تک غواصی دکن کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ثابت ہوتا ہے۔''

(علی گڑھ تاریخِ اُردو ادب، جلد اول، ص:۳۹۴)

عاشق دکھنی کا شمار ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے شعرا میں ہوتا ہے۔ بیجاپور کے اس شاعر کا ایک قصیدہ 'حضرت شاہ صبغۃ اللہ' کی مدح و توصیف میں ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے اسے اُس دور کا پہلا قصیدہ قرار دیا ہے۔ اس قصیدے کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

مُرشد مرا کامل ہے او ہور پیر ہے ہنکار کا   اس دور میں نیں ہے ولی کوئی صبغۃ اللہ سار کا

ہر اک ولی خدمت کرے لے بھیس خدمت گار کا   تیرے فقیراں کوں سدا الفقر فخری کا ہے دم

دکن کے قصیدہ گو شعرا میں علی عادل شاہ ثانی شاہی کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس کا کلیات دستیاب ہے جس میں دیگر اصناف کے علاوہ چھے قصیدے بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک حمد یہ قصیدہ اور دو منقبتی قصائد ہیں۔ منقبتی قصائد میں ایک قصیدہ حضرت علیؓ کی مدح میں ہے جب کہ دوسرے قصیدے میں بارہ اماموں کی منقبت میں شعر کہے گئے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس قصیدے کا نام 'در منقبتِ دوازدہ امام' ہے۔ اس کا ایک قصیدہ علی دادمحل کی تعریف میں ہے جس کا عنوان قصیدۂ حمل جمل ہے اور یہ ایک لامیہ قصیدہ ہے۔ ایک اور قصیدہ 'چار در چار' کے نام سے ہے جس میں عشق کے ایک واقعے کو پیش کیا گیا ہے۔ شاہی کے قصائد میں فن قصیدہ نگاری کی لوازمات اور عناصر کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کا اسلوب دل کش ہے اور اس کی شاعری جذبے اور خلوص و صداقت کی آئینہ دار ہے۔ اس نے اگر مشکل زمینوں میں شعر نظم کیے ہیں تو آسان بحروں میں بھی فن کاری دکھائی ہے۔ عبدالقادر سروری نے شاہی کے فن کو سراہا ہے اور اس کی قصیدہ نگاری کی بابت کہا ہے کہ ''شاہی کا کلام لطفِ زبان، تخئیل کی بلند پروازی، اسلوب کی جدت اور طرزِ ادا کی ندرت کے اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے''۔

دکن کے جن شعرا کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں ایک اہم نام نصرتی کا ہے۔ اُردو قصیدہ کی تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ وہ عادل شاہ ثانی کے دربار سے منسلک تھا اور 'ملک الشعرا' کے مسند پر مکین تھا۔ مثنوی 'علی نامہ' اور 'گلشن عشق' اس کے شان دار کارنامے ہیں جن پر اُردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ پروفیسر محمود الٰہی کے مطابق نصرتی نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ اس کی مثنوی 'علی نامہ' میں ہی سات قصائد شامل ہیں۔ اس نے اپنے سلطان علی عادل شاہ کی مدح میں علاحدہ ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔ معراج کے بیان میں ایک طویل قصیدہ اس کی یادگار رہے۔ اس قصیدے کے آخر میں اس نے محمد عادل شاہ کی مدح و ستائش میں بھی اشعار قلم

بند کیے ہیں۔ نصرتی نے مدحیہ قصیدوں کے ساتھ ساتھ ہجو یہ قصائد بھی تحریر کیے ہیں۔ عربی قصائد میں گھوڑوں کی تعریف و توصیف میں اشعار نظم کیے جاتے تھے اور نصرتی نے ایک گھوڑے کی مذمت میں قصیدہ لکھا ہے۔ عربی قصائد کی طرح اس کے قصیدوں میں بھی جنگ کے واقعات اور مظاہرِ قدرت وغیرہ سے متعلق بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ ماہرینِ فن نے لکھا ہے کہ اس کی مثنوی میں مختلف عنوانات کے ذیل میں درج اشعار کو اگر ایک جگہ مرتب کر دیا جائے تو ایک بہترین قصیدہ تیار ہو جائے گا۔ نصرتی نے موسمِ سرما یا ٹھنڈ کالے پر بھی قصیدہ تحریر کیا ہے جسے بقول پروفیسر محمود الٰہی ''سعدی کے بہاریہ قصیدوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے''۔ دکن میں زیادہ طویل قصیدوں کی روایت نہیں ملتی، البتہ 'علی نامہ' میں مذکور کئی قصائد قدرے طویل ہیں جن میں سو سے زائد اشعار ملتے ہیں۔ فتحِ ملنار پر اس نے ایک قصیدہ تحریر کیا ہے جس میں ۲۲۰ اشعار ہیں۔ اس کے قصائد میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور رزمیہ شاعری کا پہلو انتہائی متاثر کن ہے اور یہ صورت اُردو کے کسی اور قصیدہ گو شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اکثر ماہرینِ ادب نے نصرتی کے قصائد کی اہمیت و انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے اسے اُردوئے قدیم اور دکن کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر قرار دیا ہے۔ بادشاہ کی تلوار کی تعریف میں اس کا یہ شعر دیکھیے :

جب تے جھلک دیکھا اوک سورج تری تروار کا　　　تب تے لگیا تھر کانپنے ہو پُر عرق یکبار کا

نصرتی کے عہد کے ایک اور شاعر سید میران ہاشمی کے یہاں بھی قصیدے ملتے ہیں۔ اس نے مغلیہ صوبہ دار ذوالفقار خاں کی مدح و توصیف میں قصیدہ کہا ہے جس میں جنگی واقعات کی خوب صورت مرقع کشی ملتی ہے۔ گجراتی شاعر امینؔ جس نے مشہور مثنوی 'بہرام و حسن بانو' کی تخلیق کی تھی، اس نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ اس کے نعتیہ قصیدے کے اشعار 'اُردوئے قدیم' کے مؤلف نے پیش کیے ہیں۔ قاضی محمود بحریؔ بڑے شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے بھی قصیدے لکھے مگر وہ دستیاب نہیں ہیں۔ مشہور ترین 'قصیدۂ بردہ' کا ترجمہ بھی دکنی زبان میں کیا گیا تھا۔ سید محمد رضا نے یہ ترجمہ کر کے خوب شہرت حاصل کی۔ بعض محققین نے شاہ تراب نامی شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا وطن مدراس تھا۔ اس نے حضرت علیؑ کی مدح و توصیف میں قصیدے لکھے۔ ڈاکٹر نور السعید اختر نے لکھا ہے کہ ''اس کے قصیدوں میں نجوم اور علمِ رمل کی اصطلاحات ملتی ہیں''۔ امین الدین اعلیٰ مشہور بزرگ برہان الدین جانمؔ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں کئی تخلیقات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے کلام میں قصیدے بھی ملتے ہیں۔ 'محبت نامہ' میں نعتیہ اشعار میں قصیدے کا رنگ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد شاہ برہان الدین جانمؔ کی مدح میں بھی ایک قصیدہ تحریر کیا جس میں قصیدے کا انداز و اسلوب جھلکتا ہے۔

دکن میں اُردو شاعری کے منظر نامے پر ایک نمایاں نام ولیؔ دکنی کا ہے جسے اُردو شاعری کا باوا آدم بھی کہا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں اس کا اُردو دیوان پہنچنے کے بعد اُردو شاعری میں جو چمک پیدا ہوئی، وہ اس سے قبل مفقود تھی۔ ولیؔ نے غزل گوئی میں نام کمایا تاہم اس نے قصیدے بھی تحریر کیے۔ وہ قصیدہ گوئی میں خود کو خاقانیؔ، انوریؔ اور عرفیؔ کا

ہم نوا سمجھتا تھا۔ اس کے کلیات میں چھے قصائد ملتے ہیں۔ سب سے طویل قصیدہ حمد و نعت پر مشتمل ہے جس میں ۱۲۳ ابیات ہیں۔ مختصر ترین قصیدہ بیس اشعار پر مشتمل ہے جس میں خانۂ کعبہ کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے بقیہ قصائد بھی نعتیہ اور منقبتی نوعیت کے ہیں۔ اس نے ایک قصیدہ پیران طریقت میران محی الدین کی مدح میں جب کہ ایک اور قصیدہ شاہ وجیہہ الدین کی مدح میں تحریر کیا ہے۔ اس کے قصیدوں پر فارسی قصائد کے اثرات نمایاں ہیں۔ وؔلی کے قصیدے کی زبان غزل کی زبان سے الگ ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے قصیدے میں پرشکوہ زبان کے استعمال کیے جانے کی ضرورت کو شعوری طور پر برتا ہے۔ اس کے قصیدوں کی ادبی اہمیت اور فنی وقعت پر بحث کی گنجائش برقرار ہے مگر آنے والی نسلوں کے لیے جو زادِ راہ وؔلی نے قصیدوں کی صورت میں مہیا کیا ہے، اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ
ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

سوائے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل
ورائے خون جز نہیں دسا مجھے گل رنگ

رہے بدن پہ طنبورے کے تار گنتی کے
غصے سوں اس پہ جو آ مفلسی نے مارا چنگ

سراؔج اورنگ آبادی صوفی شاعر گزرے ہیں۔ غزل گوئی میں ان کا نام وؔلی کے بعد انتہائی احترام سے لیا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے 'کلیاتِ سراؔج' کے مقدمے میں لکھا ہے:

''قصیدے سے سراؔج کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی۔ صرف ایک قصیدہ ان کے کلام میں مل سکا ہے اور خاص ان کے متصوفانہ رنگ میں ہے۔ اس میں بھی وہ کسی کی مدح سرائی کے بجائے اپنی کہانی سناتے ہیں۔''

(عبدالقادر سروری (مرتب)، مقدمہ کلیاتِ سراج، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۳۴)

سراؔج کا یہ قصیدہ مختصر ہے اور ۳۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ موضوع ان کی متصوفانہ طبیعت سے میل کھاتا ہے، البتہ زبان کی سلاست و روانی دکن کے بیش تر شعرا سے بڑھ کر نظر آتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

کہاں رفیق موافق کہاں ہے یارِ ندیم
کہ اس کے پاس کرے رسم بندگی تقدیم

مری طرف سیں کہے اس کوں جا کے عرضِ نیاز
پس از نیاز دعا و پس از دعا تسلیم

اے آہ جا کے مری التماس یار سیں کر
کہ زخمِ ہجر سیں میرا جگر ہوا ہے دونیم

دکن میں اُردو قصیدے کی روایت میں ممکن ہے کہ اور بہت سے شعرا کے نام آنے والے دنوں میں شامل ہوں کیوں کہ مورخین نے اس دور کے سینکڑوں ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے جن کا کلام دستیاب نہیں ہے۔ اب تک کی بحث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ دکن میں اُردو قصیدہ کی روایت بہمنی دور سے قائم ہونا شروع ہوئی۔ قلی قطب شاہ نے اسے پروان چڑھایا اور پھر شاہی، غواصی، نصرتی اور ولی جیسے دکنی شعرا نے اس صنف میں جان پھونکی، زبان و بیان کی سطح پر اسے وسعت بخشی، اس کے ذخیرۂ الفاظ میں توسیع کی، فارسی قصیدوں کا تتبع کیا، اس میں اپنا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُردو میں قصیدہ نگاری کے لیے راہ ہموار کی جس سے دکنی زبان کو ترقی ملی۔ قلی قطب شاہ، غواصی، شاہی، نصرتی اور ولی جیسے شعرا نے اپنی فن کاری سے آنے والی نسلوں کو ایک قابلِ ذکر سرمایہ عطا کیا اور انھیں ایسی راہ دکھائی جس پر چل کر اُردو شاعری میں صنفِ قصیدہ کی وہ عمارت تعمیر ہوئی جس کے بلند میناروں میں سودا اور ذوق جیسے قصیدہ گو شاعروں کے نام کندہ ہیں۔

3.3.4 ماحصل

دکن اُردو ادب کا اولین مرکز رہا ہے۔ اُردو شاعری وہیں سے پروان چڑھی اور پھر پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ نظم و نثر کی دیگر اصناف کی طرح دکنی شاعری میں صنفِ قصیدہ کا وجود بھی ملتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ وہاں کے بیش تر شعرا نے قصیدے کی جانب وہ خصوصی توجہ نہ دی، جو مثنوی یا غزل کو حاصل تھی تاہم ان کی پوری شعری روایت میں مدحیہ اشعار اور نظموں کا پتہ ملتا ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ ان شعرا کی طبیعت قصیدہ گوئی سے بے زار نہ تھی بلکہ کچھ دیگر وجوہات کے سبب وہ قصیدہ کو بہ طور صنف برتنے سے عرصے تک دور رہے۔ دکن میں قصائد کے نشانات بہمنی دور سے ملتے ہیں۔ محققین نے اس عہد کے بعض شعرا کے اشعار پیش کیے ہیں۔ البتہ قلی قطب شاہ، شاہی اور نصرتی جیسے عظیم شاعروں نے اس صنف کے حسن کو نکھارنے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال کیا اور طویل قصائد تحریر کیے۔ اگر چہ دکنی شعرا نے مثنوی نگاری اور غزل گوئی کی طرف خاص توجہ دی تھی تاہم بہت سے شعرا قصیدہ گوئی کی طرف بھی مائل ہوئے تھے اور کئی اہم قصیدے ان کی یادگار ہیں۔ ان قصائد کی ادبی قدر و قیمت پر بات ہوسکتی ہے تاہم صنفِ قصیدہ میں اولین نمونے کے طور پر ان کی حیثیت ہمیشہ ہی قابلِ ذکر رہے گی۔ دکن کے بہت سے سلاطین و شعرا صنفِ قصیدہ کو پروان چڑھانے والوں میں شامل رہے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں کئی خاص باتیں ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنی ہیں۔ دکنی قصائد نے زبان و بیان کی سطح پر انتہائی اہم کام کیا ہے جس کے سبب اُردو کو وہ ذخیرۂ الفاظ مل سکا جس کے استعمال سے ہمارے شعرا نے صنفِ قصیدہ میں کارہائے

نمایاں انجام دیے اور آگے چل کر قصیدہ کی وہ عظیم الشان روایت قائم ہوئی جس کے سبب مرزا محمد رفیع سوداؔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ جیسے باکمال قصیدہ گو شاعر اُردو شاعری کو نصیب ہو سکے۔

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- دکن میں اُردو قصیدے کے پس منظر سے واقفیت حاصل کی۔
- دکن کے ابتدائی قصائد سے آگہی حاصل کی۔
- دکن میں اُردو قصیدہ نگاری کی روایت اور اس کے ارتقا سے بحث کی۔
- دکن کے اہم قصیدہ نگاروں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- دکن کی اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات کو سمجھا۔

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ دکن میں ابتدائی عہد میں قصائد کی عدمِ موجودگی کے اسباب بتائیے۔

۲۔ ابتدائی دکنی قصائد سے متعلق اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

۳۔ قلی قطب شاہ نے کتنے اور کن موضوعات پر قصیدے تحریر کیے ہیں؟

۴۔ غواصیؔ کی قصیدہ نگاری پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۵۔ نصرتیؔ کی قصیدہ نگاری کے امتیازی پہلوؤں سے بحث کیجیے۔

3.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ دکن میں ابتدائی عہد میں قصائد کی عدم موجودگی کے محققین نے کئی اسباب بیان کیے ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صنفِ قصیدہ کا بنیادی تعلق مدح سے ہے اور دکن میں بیش تر شعرا یا تو سلاطین تھے یا پھر صوفی و سالک۔ ایسے میں سلاطین کس کی مدح کرتے اور صوفی و سالک شعرا کو کسی بادشاہ یا سلطان کی مدح و ستائش کرنے میں دل چسپی نہیں تھی۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ زبان اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی، ایسے میں قصیدہ جیسی صنف میں طبع آزمائی کرنا قدرے مشکل امر تھا۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ دکنی سلاطین کا تعلق شیعہ مکتبِ فکر سے تھا۔ اس لیے ان کے نزدیک مرثیوں کی وقعت زیادہ تھی اور

مرثیہ گوئی سے شاہی قرب اور اعزاز وانعام حاصل ہوتا تھا۔اس کے علاوہ سولھویں صدی میں شاعری کا درباری اثر سے محفوظ ہونا یا پھر مثنویوں سے قصیدہ کا کام لینا بھی قصائد کی عدمِ موجودگی کے اسباب میں شامل ہے۔

۲۔ دکن میں قصیدہ گوئی کی روایت کا آغاز مشتاقؔ اور لطفیؔ سے ہوتا ہے جن کے قصائد کے نمونے دستیاب ہیں۔بعض مثنویوں یا دوسری تحریروں میں بھی قصیدے کے عناصر موجود تھے۔مثلاً مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں سلطان علاء الدین بہمنی کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔قطب الدین قادری کے 'سیرت نامہ' میں اس کے ممدوح شیخ طریقت محمد ابراہیم مخدوم کی شان میں اشعار کا نذرانہ پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح قطب شاہی دور کے شاعر احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی مدح میں اشعار ملتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگرچہ بہ طور صنفِ سخن قصیدے کا رواج دکن میں ابتدائی دنوں میں نہیں ہو سکا تاہم اس دور کی مثنویوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن کو اگر علاحدہ کر کے رکھا جائے تو ان پر قصیدے کا گمان گزرے گا۔

۳۔ قلی قطب شاہ کے کلیات میں کل بارہ قصیدے شامل ہیں جن میں سے چھے نامکمل ہیں۔اس نے حمد و نعت کے ساتھ ساتھ عید، عید قربان، عید میلاد النبی، نوروز اور بسنت جیسے موضوعات پر قصیدے تحریر کیے ہیں۔

۴۔ غواصیؔ کے کلیات میں ۲۱ قصائد شامل ہیں۔حالاں کہ محققین کے مطابق اس کے قلمی نسخے میں ۳۵ قصائد تھے جن میں سے بعض قصائد کو اس کے ناقص الاشعار ہونے یا دیگر شعرا کے کلام کا اشتباہ ہونے کے سبب کلیات میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔وہ باکمال قصیدہ گو رہا ہے جس نے فارسی کے مقبول قصیدہ گو شاعر ظہیرؔ فاریابی اور کمال خجندیؔ وغیرہ کی زمینوں میں قصیدے لکھے اور اپنے تخلیقی جوہر کا کامیاب مظاہرہ کیا۔غواصیؔ کے یہ تمام قصائد عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ہیں۔اس نے ایک قصیدہ منقبت علیؓ میں اور ایک قصیدہ باری تعالیٰ کی تحمید میں تحریر کیا ہے، البتہ ان دونوں قصائد میں بھی بادشاہ کی تعریف کا موقع اور جواز نکال لیا ہے۔غواصیؔ کے قصیدے فنِ قصیدہ گوئی پر اس کی دسترس کا ثبوت ہیں۔اس کے قصیدوں کی تشبیب یا گریز میں بھرپور فن کاری نظر آتی ہے۔اس کی مدح سرائی بھی قابلِ تعریف ہے۔اس عنصر میں اس پر فارسی شعرا کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں جو دیگر دکنی شعرا کے یہاں نظر نہیں آتا۔

۵۔ نصرتیؔ کا نام اُردو قصیدہ کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔پروفیسر محمود الٰہی کے مطابق نصرتیؔ نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔اس نے مدحیہ قصیدوں کے ساتھ ساتھ ہجویہ قصائد بھی تحریر کیے ہیں۔عربی قصائد کی طرح اس کے قصیدوں میں بھی جنگ کے واقعات اور مظاہرِ قدرت وغیرہ سے متعلق بہت

سے اشعار ملتے ہیں۔ ماہرینِ فن نے لکھا ہے کہ اس کی مثنوی میں مختلف عنوانات کے ذیل میں درج اشعار کو اگر ایک جگہ مرتب کر دیا جائے تو ایک بہترین قصیدہ تیار ہو جائے گا۔ نصرتی نے موسمِ سرما یا ٹھنڈ کالے پر بھی قصیدہ تحریر کیا ہے جسے بقول پروفیسر محمود الٰہی ''سعدی کے بہاریہ قصیدوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے''۔ دکن میں زیادہ طویل قصیدوں کی روایت نہیں ملتی، البتہ 'علی نامہ' میں مذکور کئی قصائد قدرے طویل ہیں جن میں سو سے زائد اشعار ملتے ہیں۔ فتحِ ملنار پر اس نے ایک قصیدہ تحریر کیا ہے جس میں ۲۲۰ ابیات ہیں۔ اس کے قصائد میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور رزمیہ شاعری کا پہلو انتہائی متاثر کن ہے اور یہ صورت اُردو کے کسی اور قصیدہ گو شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اکثر ماہرینِ ادب نے نصرتی کے قصائد کی اہمیت و انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے اسے اُردوئے قدیم اور دکن کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر قرار دیا ہے۔

3.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
فارس	:	ملکِ ایران کا قدیمی نام
مستعار	:	اُدھار لیا ہوا، مانگا ہوا
تشکیل	:	شکل بنانا، خاکہ تیار کرنا، شکل دینا
اُفق	:	آسمان کا وہ کنارہ جو زمین سے ملا ہوا دکھائی دیتا ہے
نوروز	:	ایرانیوں کے سال کے پہلے دن کا تہوار
تخئیل	:	خیال یا تصور کرنے کا عمل، خیال
علمِ نجوم	:	ستاروں کی گردش کا علم
علمِ رمل	:	غیب دانی کا علم، وہ علم جس میں لکیروں اور ہندسوں کے ذریعے غیب کی بات بتائی جاتی ہے
طریقت	:	دل کی پاکیزگی، تصوف، صوفیائے کرام کے مسلک کا نام جس میں عشق الٰہی کو تمام عبادات پر فوقیت حاصل ہے
پُر شکوہ	:	عظیم الشان، شان و شوکت والا
وقعت	:	مرتبہ، قدر، عظمت، حیثیت
مفقود	:	کھویا ہوا، غائب، ندارد، ناپید
دوازدہ	:	بارہ، دس اور دو کا مجموعہ
تحمید	:	الحمدللہ کہنا، تعریف، حمد، ستائش اور حمد کرنے کا عمل

بابت : بارے میں، باب میں، متعلق

3.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔	اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	:	پروفیسر محمود الٰہی
۲۔	اُردو قصیدہ نگاری (مرتبہ)	:	ڈاکٹر اُمِّ ہانی اشرف
۳۔	دکن میں اُردو	:	نصیرالدین ہاشمی
۴۔	قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین
۵۔	اُردو میں قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ابو محمد سحر

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 4 شمالی ہند میں اردو قصیدہ کا ارتقا

ساخت

4.1 اغراض و مقاصد

4.2 تمہید

4.3 شمالی ہند میں اردو قصیدہ کا ارتقا

4.3.1 اردو قصیدہ نگاری کا پس منظر (عربی، فارسی اور دکنی قصیدہ نگاری کی روایت)

4.3.2 شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کی ابتدا

4.3.3 شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کا ارتقا

4.3.4 ماحصل

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

4.6 سوالوں کے جوابات

4.7 فرہنگ

4.8 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- اُردو قصیدہ نگاری کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔
- شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کی ابتدا کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کے عہد بہ عہد ارتقا سے بحث کریں گے۔
- شمالی ہند میں اُردو کے نمائندہ قصیدہ نگاروں سے متعارف ہوں گے۔
- شمالی ہند میں اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھیں گے۔

4.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ نے قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اس کی فنی خصوصیات سے واقفیت حاصل کی، ساتھ ہی اس کی اقسام، موضوعات اور اس کی ادبی و تہذیبی اہمیت کو سمجھا اور دکن میں اُردو قصیدہ کے

ارتقا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔اب اس اکائی میں آپ شمالی ہند میں اُردو قصیدہ نگاری کے پس منظر اوراس کے آغاز وارتقا سے واقف ہوں گے،شمالی ہند کے قصیدہ نگاروں سے متعارف ہوں گے اور شمالی ہند میں اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات وامتیازات کو سمجھیں گے۔

4.3 شمالی ہند میں اردو قصیدہ کا ارتقا

4.3.1 اردو قصیدہ نگاری کا پس منظر(عربی، فارسی اور دکنی قصیدہ نگاری کی روایت)

عربی قصیدہ نگاری:

قصیدہ عربی شاعری کی ایک انتہائی مقبول صنفِ سخن ہے۔عربی کے مشہور شعرا نے اس صنف کو سنوارنے اور نکھارنے میں اپنے تخلیقی جوہر کا استعمال کیا۔دراصل عربی شعری روایت میں اس کی عظمت واہمیت مسلم ہے۔ عربوں میں اس صنف کی مقبولیت نے اہلِ فارس کو اپنی جانب متوجہ کیا اور انھوں نے عربوں سے یہ صنف مستعار لی اوراسے خوب ترقی اور وسعت عطا کی۔اہلِ فارس سے یہ صنف ہندوستان پہنچی اوراُردو شاعری میں کئی دور سے گزرتے ہوئے اس صنف نے اپنا ایک خاص مقام ومرتبہ بنایا۔اُردو میں قصیدہ فارسی سے آیا اور فارسی میں عربی سے۔اس لیے اُردو قصیدہ نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے پس منظر کے طور پر عربی اور فارسی قصیدہ نگاری پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔دکنی قصیدہ نگاری کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ اُردو قصیدہ کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے۔ جہاں تک عربی میں قصیدہ نگاری کی بات ہے تو آپ کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوگی کہ عربی شاعری میں اس صنف کو بے انتہا اہمیت حاصل تھی۔زمانہ جاہلیت میں شاعری اور شاعروں کو بڑی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔عکاظ کے میلے میں شعرا اکٹھے ہوتے تھے اوراپنے قصیدے سناتے تھے۔سب سے عمدہ قصیدہ آبِ زر سے لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کیا جاتا تھا۔ایسے سات عمدہ منتخب قصائد کو'سبعہ معلقہ' کہا جاتا تھا۔یہ قصیدے امراؤالقیس،طرفۃ بن العبد،زہیر بن ابی سلمیٰ،لبید بن ربیعہ،عمرو بن کلثوم،عنترہ بن شداد اور حارث بن حلزہ ایشکری کے ہیں۔ان شعرا میں نابغہ ذبیانی اوراعشیٰ کا بھی شمار ہوتا ہے۔آمدِ اسلام کے بعد بھی ایسے قصیدہ نگار سامنے آئے جنھوں نے زمانہ جاہلیت میں بھی شاعری کی تھی اور مشرف بہ اسلام ہوکر پیغمبرِ اسلام کی شان میں بھی قصیدے کہے ہیں۔ان شعرا میں حسان بن ثابت،کعب بن زہیر،نابغہ جعدی اور حطیہ مشہور ہیں۔عہدِ اموی میں عظیم قصیدہ نگاروں کی حیثیت سے اخطل،فرزدق،جریر اور عہدِ عباسیہ میں ابونواس اور متنبّی کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔عربی قصائد کے مضامین کا دائرہ اپنی ابتدا سے ہی بہت وسیع تھا جس میں حسن وعشق،جنگ وجدل، سیروشکار،محبت،جنس،قبائلی فضیلت کی داستانیں،خودستائی اور گھوڑے کے اوصاف بیان ہوتے تھے۔ایامِ جاہلیت میں سب سے پہلے زہیر اور نابغہ ذبیانی نے مدحیہ قصائد کی ابتدا کی اوراعشیٰ نے اس کو پیشے کے طور پر اپنایا۔

فارسی قصیدہ نگاری:

رودکی سمرقندی فارسی ادب کا پہلا اہم قصیدہ نگار ہے جس نے نہایت سادگی اور سلاست کے ساتھ زوردار قصیدے کہے ہیں۔ یہ قصیدے واقعہ نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ امیر ابوجعفر کی مدح میں رودکی کا قصیدہ ابوجعفر کی خصوصیات اور صفاتِ اعلیٰ کا بہترین نمونہ ہے۔ البتہ رودکی کا شاہ کار قصیدہ 'جوئے مولیاں' اپنی مثال آپ ہے جس کو سن کر امیر نصر بن احمد فصلِ بہار میں بخارا سے ہرات چلا آیا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شعرا میں عنصری اور فرخی ممتاز قصیدہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ قصائد محمود غزنوی کی درباری زندگی اور سماجی و تہذیبی زندگی کا اہم ماخذ بھی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں شعرا علم و فضل، شاعرانہ کمالات اور زبان و بیان کے اعتبار سے بے حد خاص ہیں۔ ان دونوں کے قصائد کا بنیادی وصف واقعہ نگاری ہے۔ منوچہری دامغانی بھی ایک معروف ترین قصیدہ نگار ہے جس نے مناظرِ طبیعی کی تصویر بڑے دل کش انداز میں کھینچی ہے۔ پھولوں، پیڑ پودوں، پرندوں اور دیگر اشیائے قدرت کی تفصیل اس کے قصائد کا حصہ ہیں۔ حکیم سنائی ایک بلند پایہ قصیدہ نگار ہے۔ علم و حکمت، تصوف، اخلاق اور مذہب ان کے کلام کا خاصہ ہیں۔ ان کے معاصر شعرا میں مسعود سعد سلمان کا نام بھی ممتاز قصیدہ نگار کی حیثیت رکھتا ہے جن میں بصیرتوں کے چراغ روشن ہیں۔ فارسی شاعری کی تاریخ میں خاقانؔی اور انورؔی ایسے قصیدہ نگار گزرے ہیں جنھوں نے قصیدے کے فن کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ خاقانؔی نے حسیات کی روایت کو فروغ دیا اور نہایت موثر قصیدے لکھے۔ مضامینِ تازہ، خلقِ معانی اور قوتِ بیان خاقانؔی کے قصائد کی جان ہیں۔ انورؔی کو قصیدہ گوئی کا امام کہا جاتا ہے۔ اس نے قصیدہ کو متنوع مضامین سے آراستہ کیا۔ اصطلاحاتِ علمی، فلسفیانہ مضامین اور افکارِ دقیق اس کے قصائد میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ سلجوقی عہد کا امیر الشعرا امیر معزی بھی اپنے عہد کا معروف ترین قصیدہ نگار ہے۔ اس کے قصائد کی بنیادی صفت سادگی ہے۔ اس نے بڑے سے بڑے اور عمیق سے عمیق خیال کو سادہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اس کا کلام تاثیر اور تازگی دونوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ غزل کے امام شیخ سعدؔی نے بھی اخلاقی اور حکیمانہ مضامین سے پُر قصیدے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی مدح میں حق گوئی اور راست بیانی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ پند و نصائح ان کے قصیدوں کا اہم حصّہ ہے۔ عرفؔی شیرازی نے بھی خودداری، غیرت اور عزتِ نفس کے اعتبار سے امتیاز حاصل کیا ہے۔ اس نے فلسفہ اور حکمت سے پُر مضامین پر مشتمل عمدہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ حکیم سنائی کے قصیدے کے جواب میں اپنے مخصوص انداز میں اس کا قصیدہ بے مثال ہے۔ یہ قصیدہ حکمت و موعظت کے عمدہ اور دل کش مضامین سے پُر ہے۔ ان شعرا کے علاوہ فارسی قصیدہ نگاروں میں عسجدی، ازرقی، ناصر خسرو، مختاری غزنوی، حسن غزنوی، سوزنی، رشید وطواط، عبدالواسع، مجیر بیلقانی، ظہیر فاریابی، جمال الدین اصفہانی، رضی الدین نیشاپوری اور کمال الدین اسمٰعیل قابلِ قدر شعرا ہیں جن کے ذکر کے بغیر فارسی شاعری کی تاریخ نامکمل رہتی ہے۔

دکنی قصیدہ نگاری:

دکن اُردو ادب کا اولین مرکز رہا ہے۔ اُردو شاعری وہیں سے پروان چڑھی اور پھر پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اُردو کی دیگر اصنافِ سخن کی طرح اُردو قصیدہ کی ابتدا بھی دکن سے ہوتی ہے۔ اوّلاً بہمنی سلطنت کے قصیدہ نگاروں میں آذریؔ، مشتاقؔ اور لطفیؔ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ البتہ گول کنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت میں بعض اہم قصیدہ نگار موجود ہیں۔ خود گول کنڈہ کا سلطان محمد قلی قطب شاہ عمدہ شاعر اور قصیدہ نگار تھا۔ اس کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ اور اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے بھی قصیدے کہے ہیں۔ بیجاپور کے شعرائے کرام میں ابراہیم عادل شاہ ثانی، محمد مقیم مقیمیؔ، کمال خاں رستمیؔ اور ملک خوشنودؔ نے بھی قصیدے کہے ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ جن شعرا کے قصائد محفوظ رہ گئے، ان میں عاشق دکنی، علی عادل شاہ ثانی، محمد نصرت نصرتیؔ اور سید میران ہاشمی کے نام سرِفہرست ہیں۔ عہدِ مغلیہ کے دکنی شعرا میں ولیؔ کا نام بے حد اہم ہے۔ اس کے علاوہ قاضی محمود بحریؔ نے بھی قصیدے کہے ہیں جو دستیاب نہیں ہیں۔ ۱۰۹۹ھ میں گجرات کے ایک شاعر امینؔ کا نعتیہ قصیدہ بھی ملتا ہے۔ ادبی لحاظ سے جائزہ لیں تو دکنی قصیدہ نگاروں میں سلطان قلی قطب شاہ، غواصیؔ، علی عادل شاہ ثانی، نصرتیؔ اور ولیؔ ایسے شعرا ہیں جن کی قصیدہ نگاری میں ادبی اور امتیازی شان موجود ہے۔

4.3.2 شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کی ابتدا

اُردو شاعری جس وقت شمالی ہند میں پروان چڑھی، اس وقت ملک میں سیاسی، سماجی انتشار اور بدحالی کا دور تھا۔ اورنگ زیب کے بعد کی صورت حال یہ تھی کہ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ فرماں روا آپسی رنجشوں میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال دکن کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے بے حد مختلف اور متضاد تھی۔ ایسی صورت میں قصیدہ نگاری کے عروج کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ قصیدہ ایک ایسی صنف ہے جسے فارغ البالی اور آسودگی کی فضا راس آتی ہے اور یہ فضا شمالی ہند میں کم کم ہی محسوس ہوتی ہے۔ ولیؔ کی دلّی آمد کے بعد جن شعرا نے اُردو شاعری کی جانب توجہ کی، ان میں جعفر زٹلیؔ اور حاتمؔ کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کے یہاں قصائد موجود ہیں مگر یہ قصائد شہرِ آشوب کی شکلوں میں ہیں اور اس کی وجہ اس دور کی بدحالی ہے۔ جعفر زٹلیؔ کی بعض طویل نظموں میں قصیدہ کا ترکیبی نظام موجود ہے۔ ان کی نظم 'ظفر نامہ شاہ عالم بہادر شاہ غازی' جوان کے کلیات کا اہم حصہ بھی ہے، ۲۸/ اشعار پر مشتمل ہے جس سے اس دور کے سیاسی اقتدار اور مذہبی عصبیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شاکر ناجیؔ نے بھی قصیدہ کی صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دیوان میں کل چھے قصائد دستیاب ہیں۔ انھوں نے اس صنف کو سنجیدگی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ زورِ کلام، عمدہ تشبیہات و استعارات، سادگی و سلاست ان کے قصائد کا خاصہ ہیں۔ ان کا سب سے طویل قصیدہ ۳۴/ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کے ایک قصیدے سے مدح کے یہ اشعار دیکھیے:

ہر شہر ہر نگر میں ہے تیرا ہی ذکر خیر
تیری سپہ گری کا ہے عالم میں قیل وقال

لشکر منے حریف کے قحط الرجال پڑے
جب کھینچ لو میان سے تم تیغ پرتگال

چوں کہ یہ ایہام گوئی کا دور تھا، لہٰذا غزلوں کی یہ خوبیاں قصیدہ کے دامن میں بھی آ بسیں مگر قصیدہ ان کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اور اُردو میں پختہ قسم کے قصیدوں سے دکن کا دامن بھی زبان کے اعتبار سے خالی تھا۔ لہٰذا ان پر دشواریوں اور کمزوریوں کا در آنا ایک فطری عمل تھا۔ حاتم کے 'دیوان زادہ' میں بھی نظم نما اور مختصر قصائد ملتے ہیں جن میں تصوف وعرفان کی جھلکیاں جابہ جا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے قصائد کی نمایاں صفت زورِ تخیل اور قادرالکلامی ہے۔ سودا کو یہیں سے ایک بنیاد مل جاتی ہے اور وہ اسے ایک معیاری صنف بنانے میں کام یاب ہوجاتے ہیں۔

4.3.3 شمالی ہند میں اردو قصیدہ کا ارتقا

شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کو سودا نے غیر معمولی بلندی اور ترقی دی۔ تمام قصیدہ نگاروں نے متفقہ طور پر سودا کو قصیدہ نگاروں کا سرتاج کہا ہے۔ مصحفی نے انھیں اُردو قصیدہ کا نقاشِ اول تسلیم کیا ہے۔ سودا نے فارسی قصیدہ گویوں کو ہی اپنے قصیدوں کے لیے مثال اور نمونہ بنایا۔ بندش کی چستی، نزاکتِ بیان، اعلیٰ تخیل، پُرشکوہ الفاظ کی کارفرمائی، توازن، نادر تشبیہات و استعارات، عمدہ اور مشکل زمینیں، جدتِ ادا، ندرت اور دل کشی ان کے قصیدوں کی خصوصیات ہیں۔ سودا نے مذہبی رہنماؤں اور سلاطین و امراے وقت دونوں کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ انھوں نے مبالغہ، اغراق اور غلوتینوں کو مدح کے لیے اہم تصور کیا اور اسے اپنایا جس سے ان کے قصائد کو نئی بلندی حاصل ہوئی۔ سودا کو زوردار اور پُراثر مطلع اور منفرد مضامین پر مشتمل تشبیہیں پیش کرنے پر قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔ ان کی تشبیہیں نہایت اچھوتی اور بامعنی ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر ان کی قادرالکلامی، علمیت اور زورِ تخیل دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ان کی گریز نہایت حسین اور مختصر ہوتی ہے۔ جب کہ مدح میں وہ اپنے ممدوح کی تعریف کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ ممدوح کے اوصافِ حمیدہ کا بہترین انتخاب کرتے ہیں۔ نازک خیالی اور طباعی ان کی مدح کی امتیازی صفات ہیں۔ سودا نے حسنِ طلب اور دعا میں بھی تنوع دکھایا ہے اور عرضِ مدعا براہ راست نہ کر کے اشارے اور کنایے میں کیا ہے۔ ان کے مشہور قصیدے شاہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں سے دو قصائد کے مطلع یہاں درج کیے جاتے ہیں:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

سوداؔ نے خاقانیؔ، انوریؔ اور عرفیؔ کی زمینوں میں کام یاب قصیدے کہہ کر اُردو قصیدے کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ اس کے علاوہ سوداؔ نے ہجو یہ قصائد میں بھی کمالات دکھائے جن میں طنز و ظرافت کو خاص دخل حاصل ہے۔ ان کی یہ ہجویں زیادہ تر مسدس اور ترجیع بند کی ہیئت میں ہیں۔ 'قصیدہ شہرِ آشوب' اس کی عمدہ مثال ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی بدحالی کا مذاق اڑایا ہے۔ سوداؔ کے ہم عصر شاعر میر تقی میرؔ یوں تو اُردو غزل گوئی کے بادشاہ ہیں مگر انھوں نے بھی قصائد پیش کیے ہیں جن میں غزل کا رنگ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سادگی، سوز و گداز، اعلیٰ تخیل اور مبالغہ ان کے قصیدوں کی خصوصیات ہیں مگر زورِ بیان، شگفتگی اور دل کشی سوداؔ کی طرح موجود نہیں۔ انھوں نے کل سات قصیدے کہے ہیں جن میں سے تین حضرت علیؓ، ایک امام حسینؓ، ایک شاہ عالم اور دو آصف الدولہ کی شان میں ہیں۔ اثر آفرینی، واقعیت، غزلیہ انداز، اختصار اور تشبیب و گریز کا ادغام ان کے قصائد کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ میر حسنؔ نے مثنوی کی طرح قصیدہ نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ مشکل زمینوں کو اپناتے ہوئے انھوں نے بڑی روانی کے ساتھ طویل قصائد پیش کیے ہیں۔ واقعیت اور اثر آفرینی ان کے قصائد کی جان ہے۔ قائمؔ چاند پوری کے بارے میں بھی اکثر ناقدین اور تذکرہ نگار اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ وہ ایک بلند پایہ قصیدہ نگار ہیں۔ قائمؔ نے مذہبی اور غیر مذہبی دونوں طرح کے قصیدے کہے ہیں۔ ان کے قصیدے فنی اعتبار سے بے حد پختہ اور عمدہ ہیں۔ احسن اللہ بیانؔ بھی سوداؔ کے زمانے کے اہم قصیدہ نگار ہیں۔ نظام الملک آصف جاہ اور حضرت علیؓ کی مدح میں ان کے شاہ کار قصائد یادگار ہیں۔ میر ضاحکؔ کے دیوان میں بھی بعض قصائد اور ہجویں موجود ہیں۔ جعفر علی حسرتؔ بھی دہلی کے باکمال شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ قادر الکلامی، روانی، برجستگی، مضمون آفرینی، نازک خیالی اور سنگلاخ زمینیں ان کے قصیدوں کی خصوصیات ہیں۔

انشاؔ اور مصحفیؔ کا دور بھی قصیدہ نگاری کے لیے نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ انشاؔ ایک باکمال شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے قصائد میں ادق الفاظ اور ملکی و غیر ملکی زبانوں جیسے ترکی، انگریزی، ہندی، پنجابی اور پشتو تک کے الفاظ شامل کیے ہیں اور قصائد کو مالا مال کر دیا ہے۔ قوتِ اختراع، علمیت، زورِ کلام، فصاحت و بلاغت، شوکتِ الفاظ، مضمون آفرینی اور بلند پروازی ان کے قصائد کی اہم خوبیاں ہیں۔ انھوں نے کل دس قصائد لکھے ہیں جن میں سے زیادہ تر قصیدے مغلیہ شاہزادوں، شاہانِ اودھ اور عمائدینِ لکھنؤ کی مدح میں ہیں۔ انھوں نے ایک قصیدہ 'طور الکلام' بے نقط بھی لکھا ہے۔ مصحفیؔ نے اپنی قصیدہ نگاری کا آغاز دہلی میں شاہ عالم اور محبت خاں کی مدح سے کیا تھا۔ اس کے بعد جب لکھنؤ سے تعلق قائم ہوا تو مرزا سلیمان شکوہ اور آصف الدولہ کی شان میں یادگار قصیدے کہے۔ ان کے قصائد کی تعداد ۸۵ سے زائد ہے۔ یہ قصائد فنی اعتبار سے بے حد پختہ ہیں۔ شوکتِ الفاظ، بلند پروازی، الفاظ کا خوب صورت استعمال، صنائع و بدائع اور بندش کی چستی ان کے قصائد کی جان ہیں۔ جرأتؔ

بنیادی طور پر قصیدہ نگار تو نہیں تھے البتہ ان کا قصیدہ سلیمان شکوہ اور پسر رائے رتن چند کی مدح میں یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔غزلیہ انداز میں موجود یہ قصیدہ مخصوص انفرادیت کا حامل ہے جس کی تشبیہیں بہاریہ اور طربیہ ہیں۔اسی طرح رنگینؔ کے قصائد ٹیپو سلطان، نواب ظفریاب خاں اور سید احمد امیر خاں کی مدح میں ہیں۔انھوں نے ریختی میں بھی ایک قصیدہ کہہ کر ایک راہ قائم کی ہے۔اس کا نام انھوں نے 'قصیدی' رکھا۔تسلسل اور روانی، صداقت اور خلوص ان کے قصیدوں کی اہم خوبیاں ہیں۔ میر قمرالدین منتؔ اور ممنونؔ دونوں والد اور پسر قادرالکلام شاعر گزرے ہیں۔منتؔ نے کلکتہ میں لارڈ ہسٹنگز کی مدح میں قصیدہ لکھا اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا۔ممنونؔ اپنے والد سے زیادہ کامیاب قصیدہ گو تھے۔ان کو سوداؔ کا اصل مقلد قرار دیا جاتا ہے۔ان کے یہاں سوداؔ کی طرح تشبیب میں تنوع، گریز میں برجستگی اور مدح میں مبالغہ دیکھنے کو ملتا ہے۔شوکتِ الفاظ، مدح میں زورِ بیان، لفظوں کی مناسب نشست و برخاست، مضمون آفرینی اور بلند پروازی ان کے قصائد کے امتیازی اوصاف ہیں۔شیخ غلام علی راسخؔ عظیم آبادی کے دیوان میں کل ۷/قصائد ملتے ہیں۔ایک نعتیہ، تین منقبتِ علیؓ، دو نواب شمس الدولہ اور ایک نواب خاں جہاں بہادر کی مدح میں ہیں۔اسی طرح جوششؔ عظیم آبادی کے دیوان میں بھی کل پانچ قصائد موجود ہیں۔ یہ قصائد سوداؔ کے تتبع میں ہیں۔مضمون آفرینی اور شوکتِ الفاظ ان کے قصیدوں کی خصوصیت ہے۔ان کے تمام قصائد مذہبی نوعیت کے ہیں۔انشاؔ و مصحفیؔ کے اس اہم ترین دور کے بعد آتشؔ و ناسخؔ کا دور آتا ہے۔لکھنؤ کا ماحول قصیدہ نگاری کے لیے بے حد موزوں تھا مگر آتشؔ و ناسخؔ نے اصلاحِ زبان پر زیادہ توجہ صرف کی اور قصیدہ کو منہ تک نہیں لگایا۔ادھر دہلی میں میرؔ و سوداؔ کے بعد سیاسی و معاشی انتشار نے خاموشی ضرور پیدا کر دی تھی مگر جلد ہی غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ جیسے شعرا نے آکر شاعری اور اس کی مختلف اصناف کو عروج اور کمال بخشا جن میں قصیدہ کی صنف بھی شامل تھی۔ ذوقؔ نے زیادہ تر اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں قصیدے کہے۔اس کے علاوہ حمدیہ، نعتیہ اور منقبتیہ قصائد بھی تھے جو اب موجود نہیں ہیں۔ایک قصیدہ نہال چشتیؒ کی شان میں بھی ہے۔شکوہِ الفاظ، صنائع و بدائع، تراکیب کی دروبست، علمی و ادبی اصطلاحات، زبان کی صفائی اور شستگی، ترنم اور نغمگی، لفظوں کی مناسب تنظیم و ترتیب اور ارکان و بحور کا عمدہ استعمال ان کے قصائد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں بھی عمدہ قصیدے کہے ہیں۔ خیال آفرینی، مبالغہ آرائی اور متانت و جزالت ان کے قصیدوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔ان کے شاہ کار قصائد کے مطالع درج ہیں:

شب کو میں اپنے سربستر خواب راحت
نشۂ عالم میں سرمست غرور و نخوت

ساون میں دیا پھر مہہِ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

مومنؔ بھی اس دور کے اہم ترین شاعر ہیں۔انھوں نے کل نو قصائد کہے ہیں۔راجہ پٹیالہ اور والیِ ٹونک کی مدح

میں قصائد کے علاوہ انھوں نے حمد، نعت میں ایک ایک اور چار خلفائے راشدین کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ یہ پہلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے خلفائے راشدین کی شان میں قصیدے لکھے۔ انھوں نے سوداؔ اور ذوقؔ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی۔ چھوٹی بحروں، سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کرتے ہوئے اور رنگِ تغزل کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے علمی اصطلاحات اور عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب کو قصیدوں کا بہ طور خاص حصّہ بنایا۔ مومنؔ کی عاشقانہ، بہاریہ اور رندانہ تشبیہیں الگ ہی لذت عطا کرتی ہیں۔ اُردو کے عظیم الشان شاعر اسداللہ خاں غالبؔ نے کل ۴ قصیدے کہے ہیں جن میں سے دو حضرت علیؓ کی منقبت اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ غالبؔ نے عام قصیدے کی روش سے ہٹ کر اختصار، جدت آفرینی اور جامعیت کو اپنایا۔ سلاست و سادگی بھی ان کے قصیدے کا حصہ ہے۔ البتہ منقبتیہ قصائد میں مشکل پسندی اور مغلق الفاظ و تراکیب کو خاص دخل ہے۔ ان کے قصائد کی اصل خوبیاں اعلیٰ تخیل، معنی آفرینی اور خوب صورت امیجری ہیں۔ فکر و فلسفہ سے بھرپور ان کے قصائد فنی اعتبار سے بے حد پختہ اور جامع ہیں۔

مصحفی کے شاگرد اسیرؔ لکھنوی نے بھی قصیدہ گوئی میں قادرالکلامی اور تنوع کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے قصیدوں کی تعداد ۳۷ تک پہنچتی ہے۔ یہ قصیدے فنی خوبیوں سے پُر اور رنگارنگ تشبیہوں، منظرنگاری، متنوع موضوعات، متانت و جزالت، تسلسلِ بیان اور روانی و برجستگی سے معمور ہیں۔ نصف سے زیادہ قصیدے تو رسولِ خدا اور ائمہ کرام کی شان میں ہیں جب کہ بقیہ واجد علی شاہ، کلب علی خاں رام پور اور پرنس آف ویلز کی مدح میں ہیں۔ نسیمؔ دہلوی کے قصیدے بھی بلاغت اور تغزل سے بھرپور ہیں۔ ان کے دیوان میں ۱۴ قصائد موجود ہیں جو واجد علی شاہ، حضرت محل اور لکھنؤ کے دیگر رؤسا اور امرا کی شان میں کہے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ آفتاب الدولہ قلقؔ کے قصائد کے دیوان 'ظہر عشق' میں چار قصائد موجود ہیں جن میں مبالغہ آرائی اور جوش و خروش نظر آتا ہے اور بالخصوص رعایتِ لفظی کا اہتمام ملتا ہے۔ سحرؔ لکھنوی نے بھی کم تعداد میں قصیدے لکھے ہیں جن میں سے 'قصیدہ درصفت بہار عیش باغ' اُردو کے شاہ کار قصائد میں شمار کیا جاتا ہے جس کا یہ شعر زبان زد ہے:

بوتلیں لاؤ برانڈی کی منائیں ساون
آج کل باغ پہ عالم ہے گھٹا پر جوبن

کرامتؔ علی شہیدی کے کلیات میں تین قصائد بالترتیب حمد، نعت اور منقبت علیؓ موجود ہیں۔ شہیدی ناسخؔ کے شاگرد ہیں۔ اسی طرح مولوی غلام امام شہیدؔ نے بھی چھوٹی اور بڑی بحر میں پرزور، صاف اور رواں قصیدے کہے ہیں۔ یہ قصائد شوکتِ الفاظ، بندش کی چستی سے پُر اور مرصع ہیں جن میں بلا کا ترنم اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں لکھنؤ بھی واجد علی شاہ کی اسیری کے بعد انتشار اور بدحالی کا شکار ہو گیا۔ منیرؔ شکوہ آبادی اور امیر مینائیؔ اسی عہد کے آخری ممتاز قصیدہ نگاروں میں سے ہیں۔ منیرؔ کے کلیات میں ۲۸ قصیدے ہیں جو نعت، منقبت اور نواب کلب علی خاں رام پور کی مدح پر مشتمل ہیں۔ مشکل زمینوں اور بحروں میں لکھے گئے یہ

قصائد قادرالکلامی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان قصائد میں کالا پانی اور ایام اسیری کے حالات بھی نظر آتے ہیں۔ رندانہ اور عاشقانہ تشبیبیں، گریز میں فن کاری اور مدح میں شان وشکوہ اور جوش وخروش ان کے قصائد کی خصوصیات ہیں۔ امیر مینائی نے ۷؍قصائد نواب کلب علی خاں کی مدح میں اور پانچ نعتیہ قصائد لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ شاہِ اودھ کی شان میں لکھے گئے ان کے قصائد حالات کی نذر ہو گئے۔ لفظی ومعنوی صنائع و بدائع کا استعمال، مشکل زمینوں کا انتخاب، مضامین کا تنوع، تشبیب میں مناظرے، زبان میں لکھنؤ کی صفائی، دہلی کی چاشنی، تخیل آفرینی اور مبالغہ آرائی ان کے قصائد کے امتیازی اوصاف ہیں۔ جلالؔ لکھنوی کا شمار بھی اُردو کے اہم قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بزرگانِ دین اور اہلِ ثروت کی شان میں قصیدے لکھے۔ زورِ بیان، مبالغہ، تسلسلِ بیان، مضمون آفرینی، صنائع اور تلمیحات کا اہتمام ان کے قصیدوں کا خاصّہ ہیں۔ خارجیت اور رعایتِ لفظی ان کے قصیدوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ انھوں نے جابہ جاجدت اور صناعی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر مختصر قصائد کہے ہیں مگر والیِ رام پور کی مدح میں تحریر کردہ قصیدہ شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ بندش کی چستی اور فارسی تراکیب کا عمدہ استعمال ان کے قصیدوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُردو قصیدہ نگاروں میں تسلیمؔ کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ تسلیمؔ دہلوی رنگ کے شاعر اور نسیمؔ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ زورِ بیان، تسلسلِ بیان، مبالغہ اور تخیل آفرینی کے سبب ان کے قصائد بڑے کام یاب ہیں۔ ان پر نسیمؔ، مومنؔ اور امیر مینائیؔ تینوں کا رنگ نظر آتا ہے۔ نوابین، اہلِ دولت وثروت کی شان میں انھوں نے قصیدے کہے ہیں اور بالخصوص واجد علی شاہ کی شان میں ان کے کئی قصیدے ملتے ہیں۔ ان کے قصائد کی ایک خصوصیت تشبیبوں میں بہار کے مختلف رنگوں کے ساتھ غم و اندوہ کا رنگ بھی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے قصائد کے لیے مشکل زمینوں کا انتخاب بھی کیا ہے۔ واجد علی شاہ کی مدح سے متعلق دو شعر ملاحظہ ہوں:

تا حشر مرا حوصلہ مجھ سے رہے بے زار
دارا کو جو سمجھوں کبھی درباں کے برابر

دانش میں فراست، فلاطوں ہو کہ بقراط
دونوں ہیں یہاں طفل دبستاں کے برابر

اُردو شاعری میں داغؔ کا اپنا ہی منفرد مقام ہے۔ غزل کی تاریخ اور دبستانوں کا ذکر داغؔ کے بغیر نامکمل ہے۔ البتہ انھوں نے قصیدے کم ہی تحریر کیے ہیں۔ ان کے تمام تر قصائد نواب رام پور اور نظام حیدرآباد کی مدح میں ہیں۔ ان کے قصائد میں تشبیب ملتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ جو تشبیبیں ہیں، وہ بہاریہ اور نشاطیہ ہیں۔ اسی طرح انھوں نے بعض قصائد کے لیے مشکل زمینوں کا انتخاب کیا ہے تو بعض کے لیے سلیس اور رواں کو اولیت دی ہے۔ متانت، صناعی، رعایتِ لفظی، علمِ نجوم، مبالغہ، تخیل آفرینی، زبان کی صفائی اور پختگی ان کے قصائد کا خاصہ ہیں۔ مدح میں انھوں نے زیادہ ہنر آزمانے کی کوشش کی ہے۔ بقول ابو محمد سحر: ''انھوں نے ممدوح کے اوصاف کے علاوہ اس

کے ساز و سامان کی تعریف میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کے قصیدوں میں ممدوح کی فوج، تلوار، گھوڑے اور ہاتھی کی توصیف سے لے کر فرش، قالین اور گلی تکیوں تک کی تعریف ملتی ہے''۔

محسنؔ کا کوروی بھی اُردو کے اہم ترین قصیدہ نگار ہیں جنھوں نے نبی کریم ﷺ کی ذات کو بنیاد تصور کرتے ہوئے صرف نعتیہ قصائد تحریر کیے۔ 'مدیحِ خیر المرسلین' ان کا شاہ کار قصیدہ ہے جس میں ہندوستانی رسوم و عقائد، مذہبی اصطلاحات و تلمیحات، ہندی، سنسکرت، فارسی و عربی کی تراکیب اور لفظیات نے اس قصیدہ کو جدید اور نادر بنا دیا ہے۔ سحرؔ لکھنوی کے شاگرد صفیرؔ بلگرامی کے ۴ قصائد میں سے 'زمزمہ صفیر' شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے جو راجہ لیلا نند سنگھ کی شان میں ہے جس کی تشبیب میں فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کی حالتِ زار بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قصیدہ بلا عنوان، نذر الانظار، قصیدہ در حمد باری تعالیٰ ان کے دیگر قصائد ہیں۔ انھوں نے موضوع اور طرزِ ادا دونوں میں جدت و ندرت کا ثبوت دیا ہے۔ قدرؔ بلگرامی کا طویل قصیدہ نظام دکن کی مدح میں ایک یادگار اور شاہ کار حیثیت کا حامل ہے جس میں دس مطالع ہیں۔ ان کے قصائد میں منظر نگاری اور سادگی و صفائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مبالغہ آرائی اور تخیل آفرینی ان کے قصیدے کا خاصہ ہے۔ غالبؔ کے شاگرد عاقلؔ دہلوی کے دیوان میں آٹھ قصائد موجود ہیں۔ ان قصائد میں بول چال کا مزہ اور تشبیہوں میں زبان و بیان کی دل کشی ملتی ہے۔ ظہیرؔ دہلوی کے قصائد شکوہِ الفاظ سے پُر نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ واجد علی شاہ، نواب کلب علی خاں، رتن ناتھ سرشار، تجلّیؔ عظیم آبادی، بہاری لال فطرتؔ اور امداد امام اثرؔ وغیرہ نے بھی قصائد تحریر کیے ہیں جو ان کے دیوان یا کلیات کا خاص حصہ ہیں۔

یہ تمام قصیدہ نگار بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک الگ الگ انداز میں نظر آتے ہیں۔ البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۷۴ء سے شاعری کی ایک نئی تحریک ادب کے افق پر نمودار ہوتی ہے۔ کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ جدید اُردو نظم کا آغاز کرتے ہیں اور شاعری کی اس نئی تحریک کے بنیاد گزار اور روح رواں قرار پاتے ہیں۔ یہیں سے جدید شاعری کا وجود ہوتا ہے۔ اس سے جہاں ادب کی مختلف جہتیں پیدا ہوتی ہیں، وہیں کلاسیکی اصناف بھی متاثر ہوتی ہیں اور اس میں بھی تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ قصیدہ جو مبالغہ اور تخیل کے بغیر اپنی تکمیل نہیں کر سکتا تھا، اب حقیقت و صداقت اور افادیت سے ہم کنار ہو گیا۔ اس طرح قصیدہ صرف مدح تک مقصود نہ ہو کر دوسرے موضوعات سے بھی متعلق ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام اسمٰعیلؔ میرٹھی کا آتا ہے جنھوں نے کلاسیکی قصیدہ کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے قصائد میں دیگر موضوعات کو جگہ دی، تخیل کے بجائے محاکات سے کام لیا۔ ان کے قصائد میں خشک سالی کا بیان، روس اور روم کی جنگ کا تذکرہ، جاڑے اور گرمی کا مناظرہ، مسلم قوم کے تنزل کے اسباب اور صورتِ حال، علما، اطبا، معلمین و مدرسین کی قدامت پرستی اور دنیا پرستی پر طنز، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید وغیرہ کو موضوع بنایا گیا۔ ۲۴۷ اشعار پر مشتمل ان کا قصیدہ 'جریدۂ عبرت' امتیازی شان رکھتا ہے۔ یہ شہر آشوب کے طرز پر تحریر کیا گیا ہے جس میں مختلف طبقات کی صورتِ حال پیش کی گئی

ہے۔ حالؔی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ میں نئے طرز، نئے رنگ و آہنگ اور جدید تقاضوں کے تحت نئے موضوعات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مدح کو باقی رکھتے ہوئے اسے جدید رجحان سے ہم آہنگ کر دیا۔ وہ قصیدہ میں صداقت، حقیقت اور افادیت کے قائل ہیں۔ ان کے دیوان میں سات مکمل اور تین نامکمل قصائد موجود ہیں۔ مکمل قصائد میں دو نعتیہ، تین سرآسماں جاہ، ملکہ وکٹوریہ اور نظام دکن کی شان میں، ایک علی گڑھ کالج کے ایک وفد کی طرف سے حیدرآباد میں اور ایک قصیدہ الغیاثیہ یا عرض حال ہے۔ نامکمل قصائد میں ایک والیِ رام پور، ایک سرسید جب کہ تیسرا نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے۔ حالؔی نے جدید اُردو قصیدہ کی باقاعدہ بنیاد ڈالی جس میں روایت سے انحراف کرتے ہوئے رسمی مبالغہ سے احتراز کیا، واقعیت کو قصیدے کی رُوح بنایا اور ممدوح کے اصلی اوصاف کا ہی تذکرہ کیا۔ انھوں نے اپنے قصائد کے ذریعے اصلاح کا کام لیا۔ نظم طباطبائی نے جدید قصیدے کو مزید وسعت دی اور ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے اسلامی تاریخ اور حضورؐ کی زندگی کے واقعات کو منتخب کیا۔ قصیدہ ذکرِ بعثت و فتح مکہ، قصیدہ معراج، قصیدہ ذکرِ ہجرت، غزوۂ بدر، قصیدہ ذکرِ جاہلیہ و جہادِ آنحضرتؐ، قصیدۂ احزاب، قصیدہ خیبر اور قصیدہ غزوۂ حنین ان کے یادگار قصائد ہیں۔ ان کے قصائد مبالغہ اور بے جا باتوں سے مبرّا ہیں۔ جنگوں کے ذکر اور واقعات پر مشتمل ان کے قصیدوں میں واقعہ نگاری اور رزم کا انداز درآیا ہے۔ ان کے تمام تر قصائد حقیقی اور اصلی واقعات پر مشتمل ہیں۔ نظم طباطبائی کی تشبیبیں مختصر ہوتی ہیں جن میں بہاریہ مضامین اور مناظر کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔ وہ عربی اصطلاحات، تشبیہات واستعارات اور تلمیحات وغیرہ کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ روانی، تسلسلِ بیان، جوش اور شکوہِ الفاظ ان کے قصیدوں کی نمایاں صفات ہیں۔

مذکورہ شعرا کے طرز سے متاثر ہو کر جدید رجحانات کے تحت بعض قابلِ ذکر شعرا جیسے صفؔی لکھنوی، محشؔر لکھنوی اور عزؔیز لکھنوی نے بھی قصیدے تحریر کیے۔ جن میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کیں مگر روایت سے رشتہ بھی استوار رکھا۔ ان تینوں شعرا نے بزرگانِ دین کی شان میں قصیدے لکھے۔ انھوں نے تشبیب کے مضامین میں تنوع اور نیا پن پیدا کیا تو مدح میں ممدوح کے محاسن اور فضائل کو بنیاد بنایا۔ ان کے قصائد میں جدتِ بیان، مضمون آفرینی، علمیت، شکوہِ الفاظ، روانی، تسلسلِ بیان، زبان کی صفائی اور پختگی اور تغزل جیسی خصوصیات نمایاں ہیں اور بے جا مبالغہ، تخیل اور طوالت سے احتراز کیا گیا ہے۔ ان شعرا کے علاوہ اس دور میں محمد حسین آزؔاد، علامہ شبلؔی نعمانی، سورج نرائن مہؔر، جلیؔل مانک پوری، ثاقؔب لکھنوی اور برج موہن دتا تریہ کیفؔی وغیرہ نے بھی قصیدے لکھے۔ ان کے قصائد کو قدیم و جدید کا حسین امتزاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال کے یہاں بعض اشعار پر قصیدہ کا اشتباہ ہوتا ہے۔ 'ما از پئے سنائی و عطّار آمدیم' اس کی عمدہ مثال ہے۔ اسی طرح ان کی نظم 'نمودِ صبح' بھی جو مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ کی شان میں ہے، قصیدے کی تشبیب معلوم ہوتی ہے۔ اس دور کے ایک اہم شاعر عبدالرحمٰن شاطؔر مدراسی ہیں جنھوں نے کئی قابلِ ذکر قصائد تحریر کیے ہیں۔ ان کا یادگار قصیدہ بعنوان 'اعجازِ عشق' ۱۳۹۶ر اشعار پر

مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ رُوحانی مسائل پر مشتمل ہے جس کا اختتام امام حسینؓ کی منقبت اور شاعر کی شاعری کی تعریف پر ہوتا ہے۔اس قصیدہ میں فلسفہ اور سائنس کے مشہور و معروف تصورات کی نفی کی گئی ہے۔طویل ہونے کے سبب حسنِ ترتیب اور ربط و تسلسل پوری طرح قائم نہیں رہ سکا۔ یہ قصیدہ زبان کی پختگی اور قدرتِ بیان کی عمدہ مثال ہے۔اس کے علاوہ اقبال سہیلؔ، نجم آفندی اور شفیقؔ جونپوری کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے قصیدے کی روایت کو مزید ترقی عطا کی۔ان شعرا نے مذہبی رنگ کے قصائد تحریر کیے۔جدید اُردو قصیدہ میں جہاں جدت اور موضوعات کا تنوع در آیا، وہیں اس کی داخلی ہیئت بھی مجروح ہوئی۔تشبیب کا اہتمام نادرد ہوا تو گریز خود بہ خود ختم ہوگئی۔مدح کا تخصص جس انداز کی مبالغہ آرائی اور زورِ بیان کے ساتھ قائم تھا، وہ بھی جاتا رہا۔جدید قصیدہ کے اندر مقصدیت اور افادیت غالب آئی تو ادبیت کا معیار قائم نہ رہ سکا۔گو کہ مذہبی رنگ کے قصائد میں روایت کا تسلسل باقی رہا مگر اس کی ادبیت مجروح ہوئی۔قصیدے کے زوال کی سب سے اہم وجہ دورِ جدید میں درباری نظام اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ ایک خاص تہذیب کے زوال کے ساتھ ساتھ قصیدہ کی صنف بھی اپنی قدیم کلاسیکی روایات اور فنی لوازمات کے ساتھ قائم نہ رہ سکی۔

4.3.4 ماحصل

شمالی ہند میں جعفر زٹلی، حاتمؔ اور شاکر ناجی کے کلام سے قصیدے کا آغاز ہوتا ہے لیکن صنفِ قصیدہ کو شمالی ہند میں جس شاعر نے غیر معمولی بلندی عطا کی اور اسے بامِ عروج پر پہنچایا، وہ مرزا محمد رفیع سوداؔ ہیں۔اُردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں سوداؔ کے قصیدے ایک نئے اور پختہ عہد کا آغاز کرتے ہیں۔فارسی طرز کے مکمل نمونے ہمیں سوداؔ کے یہاں ہی ملتے ہیں۔انھوں نے اُردو قصیدہ نگاری کو فارسی کے معیار پر لا کر کھڑا کیا۔بعد کے قصیدہ نگاروں کو اس سے تحریک ملی اور انھوں نے نئے نئے اضافے کر کے قصیدہ میں جدت پیدا کی۔سوداؔ اور ان کے معاصرین کے بعد یہ صنف بے حد مقبول ہوئی۔میر حسنؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ اور ممنونؔ کے قصائد ایک الگ رجحان کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔بعد کے ادوار میں ابتذال اور رکاکت کے بجائے متانت، زبان کی صفائی، ہمواری اور تسلسل کی طرف توجہ دی گئی۔فن کاری اور صناعی کا خاص دخل ہوا۔ذوقؔ کی فن کاری، غالبؔ کی جدتِ ادا، مومنؔ کی انفرادیت، روشؔ اور سحرؔ لکھنوی کے یہاں مقامی اور ہندوستانی رنگ اور اسیرؔ کی پُرگوئی سے قصیدہ ایک نئے رنگ میں سامنے آیا۔امیر مینائی، منیرؔ شکوہ آبادی نے بعد کے زمانے میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔محسنؔ کاکوروی نے 'مدیحِ خیر المرسلین' جیسا شاہ کار قصیدہ اُردو ادب کو عطا کیا۔شمالی ہند کے یہ ادوار اس اعتبار سے اُردو قصیدے کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں کہ سوداؔ سے لے کر محسنؔ تک قصیدہ منزل بہ منزل بلندی سے بامِ عروج تک پہنچتا گیا، اپنی انفرادیت قائم کی اور ایک باوقار صنف کے طور پر اپنی شناخت قائم کی۔

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے :

- اُردو قصیدہ نگاری کے پس منظر سے واقفیت حاصل کی۔
- شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کی ابتدا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کے عہد بہ عہد ارتقا سے بحث کی۔
- شمالی ہند میں اُردو کے نمائندہ قصیدہ نگاروں سے آگہی حاصل کی۔
- شمالی ہند میں اُردو قصیدہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو سمجھا۔

4.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ دکن کے ممتاز قصیدہ نگاروں کے نام لکھیے۔

۲۔ شمالی ہند میں اُردو قصیدہ کی ابتدا پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

۳۔ سوداؔ کی قصیدہ نگاری کی امتیازی خصوصیات سے بحث کیجیے۔

۴۔ شمالی ہند کے اہم ترین قصیدہ نگاروں کے نام بتائیے۔

۵۔ مومنؔ کی قصیدہ نگاری پر ایک نوٹ لکھیے۔

4.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ دکن کے ممتاز قصیدہ نگاروں میں سلطان قلی قطب شاہ، غواصیؔ، علی عادل شاہ ثانی، نصرتیؔ اور ولیؔ قابلِ ذکر ہیں جن کے قصیدوں میں ادبی اور امتیازی شان موجود ہے۔

۲۔ اُردو شاعری جس وقت شمالی ہند میں پروان چڑھی، اس وقت ملک میں سیاسی، سماجی انتشار اور بدحالی کا دور تھا۔ اورنگ زیب کے بعد کی صورتِ حال یہ تھی کہ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ فرماں روا آپسی رنجشوں میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال دکن کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے بے حد مختلف اور متضاد تھی۔ ایسی صورت میں قصیدہ نگاری کے عروج کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں اس صنف کو نمایاں فروغ حاصل نہیں ہوا۔ البتہ ولیؔ کی دلّی آمد کے

بعد جن شعرا نے اُردو شاعری کی جانب توجہ کی، ان میں جعفر زٹلی اور حاتم کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کے یہاں قصائد موجود ہیں۔ ان کے قصائد شہر آشوب کی شکلوں میں ہیں اور اس کی وجہ اس دور کی بدحالی ہے۔ جعفر زٹلی کی بعض طویل نظموں میں قصیدہ کا ترکیبی نظام موجود ہے۔ شاکر ناجی نے بھی قصیدہ کی صنف پر طبع آزمائی کی ہے اور اس صنف کو سنجیدگی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان شعرا کے یہاں قصیدے کے جو ابتدائی نمونے ہیں، ان ہی نمونوں سے سودا کو اپنی قصیدہ نگاری کے لیے بنیاد مل جاتی ہے اور وہ آگے چل کر اسے ایک معیاری صنف بنانے میں کام یاب ہوجاتے ہیں۔

۳۔ شمالی ہند میں صنفِ قصیدہ کو سودا نے بامِ عروج پر پہنچایا۔ بندش کی چستی، نزاکتِ بیان، اعلیٰ تخیل، پُرشکوہ الفاظ کی کارفرمائی، توازن، نادر تشبیہات و استعارات، عمدہ اور مشکل زمینیں، جدتِ ادا، ندرت اور دل کشی ان کی قصیدہ نگاری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

۴۔ شمالی ہند کے اہم ترین قصیدہ نگاروں میں سرِ فہرست سودا اور ذوق کے نام آتے ہیں جنھوں نے اُردو قصیدہ کو بامِ عروج پہ پہنچانے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ ان کے علاوہ میر تقی میر، میر حسن، غالب، مومن، انشا، مصحفی، منت، ممنون، راسخ عظیم آبادی، منیر، سحر لکھنوی، صفیر بلگرامی، عاقل دہلوی، ظہیر دہلوی اور محسن کاکوروی کے نام شمالی ہند میں اُردو قصیدہ نگاری کی تاریخ کا اہم حصّہ ہیں۔

۵۔ مومن نے کل نو قصائد کہے ہیں۔ راجہ پٹیالہ اور والیِ ٹونک کی مدح میں قصائد کے علاوہ انھوں نے حمد، نعت میں ایک ایک اور چار خلفائے راشدین کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ یہ پہلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے خلفائے راشدین کی شان میں قصیدے لکھے۔ انھوں نے سودا اور ذوق سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی۔ چھوٹی بحروں، سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کرتے ہوئے اور رنگِ تغزل کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے علمی اصطلاحات اور عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب کو قصیدوں کا بہ طور خاص حصّہ بنایا۔ مومن کی عاشقانہ، بہاریہ اور رندانہ تشبیبیں الگ ہی لذت عطا کرتی ہیں۔

4.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معانی)
توسط	:	ذریعہ
آویزاں	:	چپکا ہوا، لگا ہوا
سبعۃ	:	سات

معلقہ	:	لٹکا ہوا
مزین	:	آراستہ، سجا ہوا
بامِ عروج	:	بلندی
عمیق	:	گہرا
موعظت	:	نصیحت
فرماں روا	:	حکمراں
فارغ البال	:	آسودہ، خوش حال
قیل وقال	:	بحث وتکرار، بات چیت
قحط الرجال	:	لائق لوگوں کا کم پایا جانا
ادغام	:	ایک طرح کی دو چیزوں کو آپس میں ملا دینا
خلفائے راشدین	:	چاروں خلیفہ۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ
سپہ گری	:	سپاہی کا کام یا پیشہ
میان	:	تلوار رکھنے کا خانہ
زُنّار	:	جنیو، وہ تاگا جو ہندو گلے اور بغل کے درمیان ڈالے رہتے ہیں
مستاصل	:	تباہ، برباد
قدح	:	بڑا پیالہ، جام، ساغر
دَربان	:	چوکیدار، پہرے دار
دبستان	:	مکتب فکر، اسکول، مدرسہ
فراست	:	سمجھ داری، دانائی، تیز فہمی

4.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔ اُردو میں قصیدہ نگاری : ڈاکٹر ابو محمد سحؔر

اردو قصیدہ	۲۔	قصیدہ کا فن اور اُردو قصیدہ نگاری	:	ڈاکٹر ایم۔ کمال الدین
	۳۔	قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود	:	پروفیسر ظفر احمد صدیقی
	۴۔	اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	:	پروفیسر محمود الہٰی
	۵۔	صنفیات	:	پروفیسر قاضی افضال حسین